خاموش محبّت

رابندر ناتھ ٹیگور

ملنے کا پتہ

مکتبہ جدید لاہور

شاعر اعظم ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے بہترین شاہکار

خاموش محبّت

اور

دیگر افسانے

مترجمہ

پریم چند

بار سوئم

پبلشرز

مکتبہ چاند جموں

لاہور میں ملنے کا پتہ

نیشنل لٹریچر کمپنی ہسپتال روڈ - لاہور

(باہتمام گیان چند دیوان پرنٹر چاند پرنٹنگ پریس جموں میں چھپا)

فہرست

نذر

شاعرِ اعظم ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور

کے نام

جن کی اعجاز آفرینی نے مشرق کو مغرب

پر غالب کر کے

بے مثال ادبی معجزات پیش کیے۔

پریم چند

پریم سدن لاہور

خاموش محبت

بہار کا جوبن تھا۔ بادِ نسیم کے خوشگوار جھونکے آم کے بور کی خوشبو پھیلا رہے تھے۔ باغ میں چشمہ کے کنارے لیچی کے درختوں میں چھپی ہوئی بیگانہ کوئل کی مسلسل آواز ہنمیت کے شبستانِ بیداری کے کھلے ہوئے دریچہ میں سے آ رہی تھی۔

بہار کا پُر کیف ہیجان ہنمیت پر بھی طاری تھا۔ کبھی اپنی بیوی کے بال کھول کر اپنی انگلیوں پر لپیٹتا۔ کبھی اس کی چوڑیاں۔ کبھی اس کی گردن اور سر کے اردگرد لپٹی ہوئی چمیلی کی مالا کو کھینچتا یہاں تک کہ وہ کمزور ہو کر سہرے کی طرح اس کے رُخ پر لٹک جاتی۔ مست ہوا باہر پھولوں کو آہستگی سے جنبش زن کر کے ان میں احساس حسن بیدار کر رہی تھیں یہ ہنمیت کا عالم رعنائی تھا۔

اس کی بیوی کسُم بے حس و حرکت کھڑکی میں بیٹھی تھی جس کی شرمگین آنکھیں چاندنی سے روشن اور پُر کشش جلا پا رہی تھیں شہر کی ترغیبات پنہاں کو وہاں کسی قسم کی پذیرائی نہیں تھی:

آخر کار ہنمیت نے اس کے دونوں ہاتھوں میں اپنے ہاتھ ڈال کر ایک مفرانہ حرکت دیتے ہوئے کہا۔

کہاں ہو کسم! تم تو اتنی دُور معلوم ہوتی ہو کہ اگر دُوربین سے بھی دیکھوں تو ایک دھندلا سا نشان نظر آئے آج میں تم کو اپنے سے بہت قریب چاہتا ہوں دیکھو کیسا سہانا ہے

کسم نے گم کردہ نظروں کو آسمان سے ہٹا کر اپنے شوہر پر جمایا۔ اور زیر لب کہا "میں ایک ایسا منتر جانتی ہوں جس کے اثر سے یہ بہار۔ یہ چاندنی اور تمام حسن لبیک جنبش لب معدوم ہو کر رہ جائے۔

(۳)

یہ بات ہے تو تم ایسا نہ کرنا۔ ہاں اگر تمہیں کوئی اس قسم کا جادو آتا ہے جس سے ہفتہ میں تین چار آجائیں۔ یا رات طویل ہو کر اگلی شام سے جا ملے تو ضرور یہ کرشمہ دیکھو۔

یہ کہہ کر ہمیت نے اپنی بیوی کو ذرا اور قریب تر کھینچنے کی کوشش کی کسم نے اس کی آغوش سے بچ کر کہا۔ آج تم سے یہ بات کہنا چاہتی ہوں جس کو مرتے وقت ظاہر کرنے کا ارادہ رکھا تھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اب میرے لئے ہمرا ئیگنگی آسان ہوگی۔

اس کا شوہر اس کی بات پر چند عاشقانہ غزلوں میں سے کوئی شعر پڑھ کر اسکی مسکراہٹ کا مخول اڑا دینے والا تھا۔ کہ اتنے میں زینہ سے کسی کی کھٹ کھٹ کرنے کی آواز آئی ہمیت چپ ہو گیا اس نے اپنے باپ ہری ہر کی آمد کی آواز کو پہچان لیا تھا۔ وہ چونک اٹھا۔ جیسے کسی بدشگونی حالت پر ہو جایا کرتا ہے۔

دروازہ پر پہنچ کر ہری ہر نے کرخت آواز میں ڈانٹ کر کہا "ہمیت تم فوراً اپنی بیوی کو گھر سے نکال دو۔"

ہنمیت نے حیرت زدہ ہو کر کسم کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر کوئی تعجب زا آثار نہیں تھے۔ اس نے ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ گویا وہ چاہتی تھی کہ زمین پھٹے اور سما جاؤں۔ کھڑکی سے کوئل کی آواز آ رہی تھی۔ لیکن کبھی کسی نے اس طرف توجہ نہیں دی تھی۔ یہ دنیا کتنی حسین ہے لیکن اس کا حسن کتنی جلدی زائل ہوتا ہے۔

"کیا یہ سچ ہے" ہنمیت نے باپ کے پاس سے واپس آکر پوچھا

"بالکل درست" کسم نے کہا۔

"تم نے اب تک مجھ سے کیوں نہیں کہا"

"کوشش تو کئی دفعہ کی مگر ہمت نہ پڑی۔ میں پاپن ہوں"

"اچھا اب تم مجھے ساری بات سناؤ"

کسم نے اطمینان سے سارا قصہ کہہ سنایا جیسے آگ پر چلنے والا سہم کر دھکتے ہوئے کوئلوں پر قدم رکھتا ہے اس سے اس کو از حد تکلیف تھی، مگر اسکی کوئی علامت ظاہر نہ ہونے پائی تھی۔

ہنمیت نے ساری داستان سنی اور کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا کسم کو معلوم ہوا کہ پریمی چلے گئے۔ اب کبھی ملن نہیں ہوگا اس پر اسے کوئی تعجب نہ تھا جیسے جو کچھ اسے پیش آیا تھا وہ اس کا روزانہ کا معمول تھا وہ اس قدر بےحس ہو گئی تھی۔ جیسے دنیا اسے معمولی نظر آتی تھی۔

ہنمیت کے اظہار تلطف نے اس کے لبوں پر ایک ہلکے سے محروم نشاط تبسم کو نمودار کیا جس طرح کوئی نشتر کا زخم ہوتا ہے وہ کیفیت جس کی انتہا کو وہ بہت گہرا خیال کرتی تھی جس میں ذرا سی جدائی بھی اس قدر دل کو مسوسنے والی ہوتی تھی۔

جو زبان اور زمین کی تعینات سے آزاد معلوم ہوتی تھی۔ اور جس کا آئندہ زندگی میں بھی ختم ہونا تصور میں نہیں آتا تھا۔

محبت کی یہی کائنات تھی۔ اتنا نازک رشتہ سماج کے ظلم کا ایک اشارہ اس کو ختم کرنے میں کامیاب ہوگیا اور اسکی ساری وسعت کو نابود کرنے میں کمال دکھلا گیا

تھوڑی دیر ہوئی کہ ہنمیت نے کہا تھا۔ جیسی پرسحر رات ہے" رات تو وہی باقی تھی اور کوئل کی دلکش آواز بھی ہاں نرم ہوا ابھی تک کھڑکیوں کے پردے ہلا رہی ہے۔ اور چاندنی بھی کسی محروم التفات حسینہ کی طرح کنارہ پر کھڑی ہے کہا یہ سب نظر فریبی ہے یہ محبت تو مجھ سے بھی زیادہ قول اور فعل میں بے اعتبار ہوئی۔ کسم نے یہ محسوس کیا

(۳)

اگلے دن علی الصباح ہنمیت رات بھر کا بیدار۔ موٹے پریشان، بوڑھے پیارے کھرسال کے گھر پہنچا۔

نرمی سے بوڑھے نے پوچھا "کیا خبر لائے"

انگاروں پر لوٹتے ہوئے غصہ میں کانپتے ہوئے جوش سے ہنمیت نے کہا

"تم نے ہماری ذات بگاڑ دی تم نے ہمارا گھر برباد کردیا تمہیں اس کا خمیازہ اٹھانا پڑیگا" اسکے بعد جوش وخروش اور شدت جذبات نے گلوگیر ہوکر اسے چپ کرادیا

پیارے مسکرایا اور کہا "تم لوگوں نے میری ذات بنادی مجھے سماج میں بسنے دیا تم نے ہمارے گھر پر امرت برسایا۔ تو میری پریشانیوں پر اتنے مہربان ہو رہے ہو"

اگر ہنمیت کا غصہ پرانے براہمنوں کی طرح ہوتا تو پیارے بھسم ہو جاتا لیکن یہ

غصہ کی آگ اب اندر ہی اندر نوجوان کے جذبات کو پھونک رہی تھی اور یہ بڈھا مرنے سے مسکرا رہا تھا۔

ہنمیت نے رک رک کر کہا "میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟"

پیارے نے کہا "یہ تو مجھے دریافت کرنا ہے کہ میری بیٹی، اکلوتی بچی نے جو میری سب کچھ ہے۔ اس غریب لڑکی نے تمہارے باپ کا کیا نقصان کیا تھا۔

"میں سمجھا، کیا کہا تمہیں یہ معلوم نہیں اچھا بیٹھ جاؤ۔ بیٹا! جس قدر اطمینان سے ممکن ہو سنو۔ میں بتلاتا ہوں۔ قصہ طویل ہے مگر خالی از دلچسپی نہیں ہے"

"جب میرا داماد اپنی بیوی کا زیور لیکر انگلستان چلا گیا۔ تو تم ابھی بچے تھے لیکن شاید تم کو وہ ہنگامہ یاد ہوگا۔ جو پانچ برس بعد اس کے بیرسٹر بنکر آنے پر گاؤں میں ہوا تھا۔ تم یہاں کلکتہ میں سکول پڑھتے تھے۔ تمہارے باپ نے برادری جمع کر کے اور خود لیڈر بن کر فیصلہ سنایا۔

"اگر تم اپنی بیٹی کو اس کے خاوند کے پاس بھیجنا چاہتے ہو تو پھر اس سے کوئی سروکار نہ رکھنا میں نے اس سے کیسی کیسی التجائیں کیں کہ ایک بار تو معاف کر دیں میں نے کئی طرح کی ذلتیں برداشت کیں اور کہا کہ اگر تم ذات میں ملاؤ تو اپنے داماد کو پرائشچت پر آمادہ کر لوں گا۔ لیکن تمہارا باپ ٹس سے مس نہ ہوا۔ میں اپنی عزیز بیٹی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑنے پر تیار نہ ہو سکا۔ ذات چھوڑ دی اور کلکتہ آکر رہنے لگا۔ لیکن برادری کے ظلم نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ میرے بھتیجے کی منگنی ہوئی تو تمہارے باپ نے لڑکی والوں کو جا کر کہا سنا۔ اور نسبت فسخ کر ڈالی۔ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے میں نے قسم کھالی ہے کہ برہمن نہیں اگر اس کا بدلہ نہ لوں

"کیا اب معاملہ سمجھے۔ ٹھیرو آپ بیتی کا باقی حصہ زیادہ دلکش ہے"

جب تم کالج میں داخل ہوئے۔ تو بلونت جسے ہم لوگ چچا کہتے ہیں افسوس وہ اب اس عالم میں نہیں ہے۔ تمہاری قیام گاہ کے قریب ہی رہتے تھے انھوں نے ایک نوجوان لڑکی کسم کو جو بچپن میں بیوہ ہوگئی تھی۔ اپنے پاس رکھ لیا کسم بلا کی حسین تھی۔ بلونت کو کالجیٹ لڑکوں کی جہالت سے محفوظ رکھنے کیلئے بڑی تکلیفات اٹھانی پڑیں۔ لیکن ایک نوجوان لڑکی کے لئے بوڑھے سے نظر بچانا مشکل نہیں تھا۔ اگر اسے چھت پر ہوا کھانے یا کسی کام کیلئے جانا پڑتا تھا۔ اور ادھر یہ معلوم ہُوا۔ کہ تمہارا جی بھی اس برابر والے بالاخانے کے علاوہ کہیں نہیں لگتا تھا۔

آمنے سامنے چھتوں پر تم دونوں پر کیا گزرتی رہی وہ تم خود ہی جانتے ہو لیکن اس طرف گھر میں بلونت کو لڑکی کے اطوار سے شبہ لاحق ہُوا۔ کیونکہ گھر کے کام کاج میں اس کی فراموش کاری بڑھ گئی۔ بھوک کم ہوگئی۔ تندرستی اور بشاشت جاتی رہی ایکدن انھوں نے اسے بلا وجہ روتے دیکھ لیا۔ اور آخر کار ان پر تمہارے بالائی نامہ و پیام ظاہر ہوگئے اور معلوم ہوگیا۔ کہ تمہیں تنہائی میں پڑھنے کا شوق بڑھ گیا کالج سے اکثر غیر حاضر رہنے لگے۔ اور بالاخانہ کے زینہ پر یکہ و تنہا کتابیں لیکر چپ چاپ بیٹھے رہتے جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بلونت نے مجھ سے مشورہ لیا۔ اور میں نے رائے دی چچا تم ایک عرصہ سے تارک الدنیا ہو کر بنارس جاکر رہنے کا ارادہ کر رہے ہو بہتر تو یہ ہے کہ اب پورا کرلو۔ لڑکی کی دیکھ بھال اب میرے ذمہ رہی

" تو شکرانہ بجا لاکر بنارس چلے گئے۔ اور میں نے کسم کے رہنے کا انتظام اپنے بے تکلف دوست چیٹر جی کے یہاں کروا دیا۔ جو قریب پڑوس میں رہتے تھے اور یہ ظاہر

کیا کہ کسم اس کی سگی بیٹی ہے۔

نتیجہ جو ہُوا وہ تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو پچھلے واقعات دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ایک کہانی معلوم ہوتی ہے مجھے لکھنا نہیں آتا۔ ورنہ پڑھنے پر بھی فسانہ معلوم ہوتا۔

میرے بھتیجے کا رجحان اگرچہ اس طرف ہے۔ اس سے کہوں گا کہ وہ اسے قلمبند کرنے کی کوشش کرے۔ ہاں اگر ہم تم دونوں مل کر کوشش کریں تو اس سے بہتر کوئی نہیں لکھ سکتا۔ گو اس کا انجام مجھے معلوم نہیں ہے

ہیمنت نے پیارے کے آخری الفاظ پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس نے اپنے سلسلہ خیال کے مطابق پوچھا۔ "کسم نے کیا اس قسم کی شادی پر اعتراض نہیں کیا؟"

پیارے نے کہا "یہ سوال آسان نہیں ہے تمہیں تو تجربہ ہو گیا ہے اور جانتے ہو عورت کیا چیز ہے۔ جب وہ نفی کا صیغہ پڑھتی ہے تو اس کا مطلب اثبات ہوتا ہے۔

کسم نئے مکان میں پہنچی۔ تو تمہارا روزانہ دیدار موقوف ہُوا۔ وہ اداس رہنے لگی کچھ عرصہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ تم نے کسم کا پتہ لگا لیا ہے تو تم بھی کالج کا راستہ بھولنے لگے۔ چٹرجی کے مکان کے سامنے کتابیں لیکر دروازے کے سامنے گردش کناں ہونا اور ہونا اور کبھی کبھی ٹھیر جانا جیسے کسی گمشدہ شے کی تلاش کر رہے ہو۔ تو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ کہ تم کو کالج کے راستہ کی تلاش ہے کیونکہ ایک شخص معزز کی کھڑکی میں ہو کر راستہ میں پردار کیڑوں یا محبت کا دم بھرنے والوں کی طرح اچھلنا ہی تھا مجھے لڑکی کی تکلیف اور تمہارے

تعلیمی شغل میں ہرج دیکھ کر افسوس ہوتا تھا۔

آخر کار ایک دن میں وہاں گیا اور کسم کو تنہائی میں لیجا کر کہا دیکھو اپنے چچا سے شرم مت کرو۔ بیٹی میں جانتا ہوں کہ تمہارے دل پر کس کا قبضہ ہے وہی سامنے والا لڑکا اس کی بھی حالت اچھی نہیں ہے۔ میں بخوشی تمہارے تعلقات قائم کرنے کی کوشش کروں گا"

یہ سن کر کسم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور میں وہاں سے چلا آیا۔ اس کے بعد بھی میں نے آمدورفت جاری رکھی۔ اور تمہارا ذکر کرتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد اس کی شرم دور ہو گئی۔ اور میں نے اس کے دل پر یہ بات نقش کر دی۔ کہ صرف شادی سے ہی مشکل حل ہو سکتی ہے۔ پھر بھی اسے اصرار تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے جب ہم مختلف پہلوؤں پر بحث کر چکے تو کسم نے مجھے تمہاری رائے معلوم کرنے کے لئے کہا۔ میں نے اس کی مخالفت کی اور کہا۔ ——— وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں اسے اس الجھن میں ڈالنے سے کیا فائدہ ہو گا۔ دوسروں پر اس راز کے افشا ہونے کا تو کوئی شبہ نہیں پھر اسے ساری عمر کے لئے کیوں رنج دیا جائے۔

میں تو یہ سمجھ نہ سکا۔ کہ کسم کے دل میں یہ بات کیوں آئی۔ وہ خاموش روتی رہی آخر کار جب میں نے کہا۔ کہ بس اسی طرح رہنے دو۔ تو وہ بالکل پھوٹ پڑی۔ اور معاملات یہاں تک پہنچ گئے۔ جب چیٹرجی کو میں نے تمہارے پاس پیام بھیج کر روانہ کیا۔ اور بعد کو پتہ چلا کہ تم نے بلا تامل اپنی منظوری دیدی مقررہ دن سے پہلے کسم اس تجویز کی مخالف ہو گئی۔ اس نے مجھ سے التجا

کی "اچھا چچا میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اس کام کو روک دیجئے"——— میں نے کہا——— فضول کہتی ہو اب تو سب کچھ طے ہو گیا۔ آخر میں ان لوگوں کو کیا جواب دوں گا"

اس نے مجھ سے کہا "مجھے کہیں بھیج دو۔ ان سے کہہ دینا کہ وہ مر گئی ہے"

میں نے اعتراض کیا "اس لڑکے غریب کا کیا حشر ہو گا اس کے خوابوں کی تعبیر ظاہر ہونے والی ہے۔ وہ ہفت افلاک پر ہے کیا میں اسے کہہ دوں۔ کہ تم مر گئی ہو، اس کے بعد مجھے اس موت کی خبر دینی ہو گی۔ اور جواب میں تمہاری حالت کی یاد ستائے گی تم اس بڑھاپے میں مجھ پر استری ہتیا اور برہمن ہتیا کا پاپ لگاؤ گے

آخر ایک نیک اور مبارک ساعت میں تمہارا بیاہ ہو گیا۔ اس طرح میرا ارادہ پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا۔ باقی حالات تم جانتے ہو تمہیں جو ہمیں کہنا تھا اس وقت کہہ چکے تھے۔ پھر تم نے یہ راز ظاہر کیوں کیا۔ ہیمنت نے دریافت کیا۔

——— کچھ دن ہوئے جب تمہاری بہن کی نسبت طے ہونے کا خیال پتہ چلا تو میرے ضمیر نے مجھے ملامت کرنی شروع کر دی ایک برہمن کی ذات کو مجھے اس طرح بگاڑنا پڑا۔ میں نے اپنے اوپر ایک فرض عاید کر لیا تھا۔

اب کسی دوسرے برہمن کی معصومیت پر داغ نہ لگنے دینا میں اپنا فرض خیال کرتا تھا۔ اسی لئے میں نے ان کو لکھ دیا۔ کہ میرے پاس ہیمنت مکرجی کی بیوی کے شودر ہونے کا ثبوت موجود ہے۔

ہیمنت اپنے جذبات کو بڑی مشکل سے روک سکا۔ تھرائی ہوئی آواز

میں کہا: "اب اگر میں اُسے چھوڑ دوں تو اس لڑکی کا کیا حشر ہوگا۔ اس کی کون خبر گیری کرے گا!"

میرا جو فرض تھا۔ وہ ادا کر دیا۔ لوگوں کی مطلقہ عورتوں کو جگہ دینا میرا کام نہیں ہے"

"یہاں آؤ" پیارے نے نوکر کو آواز دی "ہنمیت بابو کے لئے شربت کا ایک یخ بستہ گلاس لاؤ"

(۴)

پورنماشی کو گذرے پانچویں رات تھی۔ کوئل کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ چشمہ کے کنارے پنچی کا پیڑ سیاہ پس منظر پر ایک بدنما داغ معلوم ہوتا تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ اندھیری رات میں اس کی سرسراہٹ سے آسیب کا گمان ہوتا تھا۔ آسمان پر ستارے ٹکٹکی لگائے تک رہے تھے۔ جیسے تاریکی کو چیر کر کسی راز مخفی کی تلاش میں محو ہیں۔ ہنمیت کی خوابگاہ تاریک ہے۔ وہ پلنگ پر کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا۔ باہر رات کی تاریکی کو دیکھ رہا ہے۔ اور فرش پر سر جھکائے کسم بیٹھی ہے۔

مصوّر تقدیر نے اس ابدی رات میں جذبات کے طلاطم میں گھری ہوئی دو خاموش ہستیوں کو ایک تصویر پر نقش کر دیا ہے جن میں ایک داد رس اور دوسرا داد خواہ معلوم ہوتا ہے ان کی مشتاق آنکھوں سے دیکھنے کیلئے وقت کی رفتار خود ساکت ہو گئی تھی۔ جس طرح کوہ تموج خیز سمندر ساکت ہو جاتا ہے

اچانک پھر کمرے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ آئی یہ ہری مہر کے قدموں

کی آواز تھی - وہ آکر بولے:- تم کب تک اس عورت کو گھر سے نکالو گے میں جیلے بہلنے پسند نہیں کرتا "

ہری ہر کی آواز سن کر کسم تڑپ کر ہمینت کے قدموں سے لپٹ گئی اور آخری الفاظ سن کر حضرت کا سلام کیا - اور قدموں کی خاک لیکر اس کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ جانے کیلئے اٹھی -

ہمینت نے باپ کو جواب دیا " میں اپنی بیوی چھوڑنا نہیں چاہتا ہری ہر چلایا ——— "کیا تم ہماری ذات خراب کرو گے ؟"

ہمینت نے جواب دیا " میں ذات پات نہیں مانتا "

" پھر تم دونوں یہاں سے نکل جاؤ -

(۱)

نوازن کی دنیوی زندگی معمولی قسم کی تھی۔ شعریت سے لبریز اور خیال آفرین۔ اس نے کبھی خواب میں بھی یہ نہیں سوچا تھا۔ کہ روزانہ زندگی میں بھی جذباتِ شاعری کا ہونا ممکن ہے؟ جس انداز سے گاؤں کی پرانی چوپال میں اس کے پاؤں تسکین سے دراز تھے۔ اسی طرح اس پرانے عالم میں اپنے قدیمی جانکار مقام پر وہ اپنا حق استوار کئے ہوئے تھا۔ اس کے خیالات میں غلطی سے بھی تفکرات کی رونمائی ممکن نہیں تھی۔

وہ روزانہ طلوع آفتاب سے قبل ہی بیدار ہو جاتا تھا اور اپنے گھر کی گلی کی طرف کا دروازہ کھول کر چبوترے پر بیٹھ جاتا تھا۔ بے فکری سے حقے کے کش لگایا کرتا تھا۔ لوگ گلی میں آتے جاتے تھے۔ گاڑیاں گھوڑے رواں دواں تھے۔ فقیر گیت گاتے۔ پرانی بوتلوں کے خریدار پرانی بوتل پرانی بوتل!! چلا کر چلے جاتے تھے۔

نوازن پُر خیال جذبات میں سرشار آگئے۔ دن کے واقعات کو دیکھتا رہتا تھا۔ اگر کسی دن کوئی کچے آم یا خشک املی فروخت کرنے والا جاتا تو اس دن کافی دیر کی بک جھک کے بعد کچھ سودا بن جانے پر رسوئی میں کوئی خاص کھانا

تیار ہو جاتا۔ پھر تیل کی مالش کے بعد نہا دھو کر کھانا کھانے کے پیچھے منہ میں پان دبائے حقہ پیتے ہوئے لباس فاخرہ سے ملبوس ہو کر دفتر کو روانہ ہو جاتا۔

شام کو دفتر سے واپسی پر اپنے ہمسایہ رام لوچن کے گھر پر بلند آہنگی سے سندھیا کرنے کے بعد کھانا کھاتا تھا۔ اور رات کو خوابگاہ میں جا کر اپنی زوجہ پر سندری کے دیدار سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ دونوں مرد عورت آپس میں گفتگو کیا کرتے تھے ——— کل فلاں دوست کے لڑکے کا بیاہ ہے۔ اس کے گھر سے دعوت آنے پر کیا کچھ بھیجا جائے گا۔ نئی کہارن بڑی ڈھیٹ ہے۔ کہنے میں نہیں آتی۔ اپنے دل سے کام کرتی ہے کپڑے بہت میلے ہو گئے ہیں۔ دھوبی دھو کر نہیں لایا ———

کیا کوئی شاعر اس قسم کی معمولی باتوں کو اپنے اعجاز آفرین کلام کے قالب میں ڈھال سکتا ہے؟ نوازن بابو کو وقتاً فوقتاً اس قسم کے جذبات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

پھاگن کے مہینہ میں ہر سندری بیمار ہو گئی۔ بخار کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر جس قدر کونین دیتے تھے۔ اسی قدر بخار بڑھتا تھا۔ متواتر بیس یوم گزر گئے ——— بائیس دن ——— پھر چالیس دن گذر گئے۔ لیکن بیماری میں افاقہ کی نوبت نہ آئی۔

نوازن کا دفتر جانا بند ہو گیا کافی دن گذر گئے اس نے رام لوچن کے گھر جا کر سندھیا بھی نہیں کی۔ بیچارہ کیا کرے کیا نہ کرے کبھی گھر جا کر مصیبت زدہ کی صورت دیکھتا ہے اور کبھی باہر برآمدے میں حقہ کے دم لگاتا ہوا بحر تم میں غرق ہو جاتا ہے دونوں وقت ڈاکٹر حکیم دید بدلتے

رہتی ہیں۔ جس کسی کا کوئی ذکر نام لیتا ہے۔ اس کے علاج کا تجربہ کرنے کا خیال بیدار ہوتا ہے اسی طرح گورے سنتالیس یوم تک کامل توجہ سے علاج اور تیمارداری کرتے ہوئے ہرسنداری کا بخار ٹوٹ گیا وہ بڑی کمزور ہو گئی اس کا جسم صرف چمڑا مڑھا ہوا ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ رہ گیا۔

بسنت کا موسم بہار آ گیا۔ لذت افروز جنوبی سمت کی ہوا موجزن ہونے لگی۔ سردی کم ہو گئی۔ گرمی دن بدن تیز ہونے لگی۔ ہرسنداری کی خوابگاہ کے کمرہ کے پیچھے ہمسایہ کا ایک باغیچہ تھا۔ جو برسوں سے نگہداشت نہ ہونے کی وجہ سے اجاڑ پڑا تھا۔

کافی دن گزرے تھے۔ کسی نے ولائتی پھولوں کی بیل کی ٹہنیاں لا کر وہاں لگا دی تھیں۔ جلد ہی برسات ہونے کے سبب سے وہ شاخیں جڑ پکڑ گئیں اور ہوتے ہوتے ان میں پھول نکل آئے۔ مگر پھر اس کے بعد کسی نے اس طرف توجہ نہ دی۔ اسی لئے وہ ایک خشک ٹنڈوں کے ایک بھدے سے چھپر پر بری طرح سے پھیل رہی تھیں پرانی بیر کے پیچھے گھاس کا ایک جنگل تھا۔ رسوئی کی دیوار کے نیچے چند اینٹیں اپنی جگہ چھوڑ کر باہر نکل آئی تھیں اور وہاں ہی آدھ جلے کوئلوں اور راکھ کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ جو دن بدن افراط پذیر تھا۔

ہرسنداری کی چارپائی کھڑکی کے قریب ہی بچھی ہوئی تھی وہ روزانہ اس کھڑکی سے اس ویران باغیچہ میں کھلے ہوئے پھولوں اور سرسبز بیلوں کو دیکھتی تھی۔ اس کیلئے بیماری سے اٹھنے کے بعد یہ نظارہ اس قدر سہاؤنا تھا کہ وہ اسے گھنٹوں دیکھنے کے باوجود بھی اکتاتی نہیں تھی ان ایام میں اسے باغیچہ کی سیر

ایسی راحت بخش محسوس ہوئی تھی۔ جس کا پہلے کبھی خیال نہیں آیا تھا۔

گرمی میں پانی کا زور کم ہو جانے پر چھوٹا سا دیہاتی نالہ اپنے ریت کے بستر پر بڑی خراب حالت میں دم توڑ کر پڑا ہے مگر اس کا پانی پہلے سے زیادہ صفا ہوتا جاتا ہے۔ نورِ مشرق کے ضیا پاش ہونیوالی کرنیں زیادہ صفائی سے اپنا عکس اس پر بکھیر رہی ہیں اور اندھیری رات میں گم کردہ راہ مسافروں کی رہنمائی کرنے والے درخشاں ستارے چمک چمک کر اس مصفا پانی پر جھلملاتے ہوئے نظر آتے ہیں اسی طرح ہر سندری کی خوشنمائی بیماری کے ٹل جانے پر جلال نکھار لا رہی تھی۔

اس حالت میں جب اس کا شوہر قریب بیٹھ کر طبیعت کی فرحت کی متعلق استفسار کرتا تو اس کی آنکھوں میں محبت کی بوندیں جھلملانے لگ جاتی تھیں بیماری کی وجہ سے اس کے پژمردہ چہرہ پر اس کی آنکھیں اب قدرے بڑی نظر آتی تھیں۔ سوال کے جواب پر وہ اپنی پُر کشش آنکھوں کی محبت سے اپنے شوہر سے متوجہ ہو کر ہاتھ پکڑ لیتی۔ اور کافی دیر تک خاموشی سے ٹکٹکی لگا کر دیکھتی رہتی تھی۔ اس وقت نوازن بابو پر بھی کچھ سحر کاری ہو جاتی تھی۔ اور جذبات مسرت سے سرشار ہو اٹھتے تھے۔

چند یوم اسی طرح گزر گئے۔ ایک رات کے وقت دیوار کے پاس پیپل کے پرانے درخت کی چاروں طرف پھیلی ہوئی ٹہنیوں میں سے پورنماشی کے چاند کی دلکش شعاعیں آہستہ آہستہ جھولنے والے پیپل کے نازک پتوں سے چھن چھن کر ان دونوں کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ جو ایک چارپائی پر ستائے

کے عالم میں کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے - ہر سندری نے اپنے نرم و نازک بازو شوہر کی گردن میں ڈال کر شیریں انداز میں کہا ——

میرے تو بال بچہ ہوتا ہی نہیں اب آپ اپنا دوسرا بیاہ کر لیں تو بہتر ہے "

ہر سندری چند دنوں سے اسی خیال سے چُور ہتی تھی - انسانی جذبات میں جب محبت اور الفت پذیر کشش کا طوفان بپا ہوتا ہے - تو وہ یہ خیال آمادگی کرتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کے لئے سب کچھ کر سکتا ہے - اس وقت قربانی کے جذبات بھی اس پر ہر چہار اطراف سے غالب آجاتے ہیں - جیسے جیسے حوصلہ بلند ہوتا جاتا ہے اس کی خواہشات بھی زیادہ پُر جوش ہوتی جاتی ہیں - اور یہ جی چاہتا ہے کہ اپنے محبوب پر دل و جان قربان کر دے

ایسی ہی کیفیت کے عالم میں ایک روز ہر سندری نے خیال کیا کہ میں اپنے شوہر کے لئے کوئی بڑی قربانی کروں گی پھر اس نے سوچا افسوس ! میں بیچاری بھلا کر ہی کیا سکتی ہوں ! میں ہوں کیا جو ان کے لئے کچھ کر گزروں اس دنیا میں میرا ہے ہی کون ! اور کیسے قربانی کر سکتی ہوں - جو کچھ ہے وہ سب ان کا ہی عطیہ ہے - میں خود بھی تو ان کی ہی ہوں —— ہائے ! میرے پاس دولت نہیں - عظمت نہیں - عقل نہیں ، تمیز نہیں ان پر کیسے قربان کروں - صرف ایک جان ہے اسے ہی ان پر نچھاور کر دوں گی مگر کیا میری اس حقیر کی زندگی بھی کوئی قدر و قیمت رکھتی ہے "

وہ پھر سوچنے لگی —— افسوس ! کیا ہی بہتر ہوتا کہ میں ایک

خوشنما شکل وصورت والے گورے سفید ملائم فریب کی طرح شعور کو مسحور کرنے والا اپنی جان کی سدح سیکلیجے کا ٹکڑا۔ چشم وچراغ ۔ دلی مسرت اور بشاشت کا ہدیہ پیش کر سکتی؟ مگر افسوس! میری یہ خواہش بھی دل ہی میں رہی میں اسی آرزو میں مرمٹی مگر کامیابی نہ ہوئی کیا کروں؟

اس نے فیصلہ کیا ——— میں اپنے شوہر کا دوسرا بیاہ رچاؤنگی۔ ان کے لئے ایک نئی نویلی شباب بھا دلہن کو بیاہ کر گھر لاؤں گی

اچانک اسے خیال آیا۔ کیا میں سوت کو اپنی چھاتی پر بٹھاؤنگی۔ اپنی مسرت کا خزانہ اور امیدوں کے دامن کو دوسرے کے سپرد کردوں گی؟ ... میں کیسی گناہگار اور خود غرض ہوں جو اپنے لمحاتی آرام کو ان کی مسرت پر قربان کرتے ہوئے خوف کھاتی ہوں۔ اس میں ڈرنے کی بات ہی کیا ہے؟ نا معلوم عورتیں سوت کے نام سے اس قدر کیوں گھبراتی ہیں؟ مجھے تو اس میں خوف کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ اگر ہمیں اپنے شوہر سے محبت ہے تو سوت سے عناد کیوں ہو؟ ہمارے سوامی کو پیار کرنے والی اور ہمارے سوامی کی پیاری ہمیں پیاری کیوں نہ ہو؟ مجھے تو اس کا کوئی سبب نظر نہیں آتا! اچھا میں اپنی سوت سے محبت کی کوشش کروں گی۔ دیکھئے کامیاب ہوتی ہوں یا نہیں؟

ہر سندری نے یہ فیصلہ تو کر دیا۔ مگر فی الفور کسی آنے والے خوف کے ڈر سے اس کا دل دہل گیا۔ اس نے دوبارہ اپنے متزلزل دل کو سنبھالا طرح طرح کی باتوں سے جذبات پر قابو پایا۔ اور آخر کار اپنا یہ خیال اپنے سوامی کے

سامنے ظاہر کر دیا

نوازن بابو ہر سندری کی زبان سے یہ حیرت انگیز تجویز سن کر مسکرا دیا اور انہوں نے اسے باتوں ہی باتوں میں اڑا دیا۔ ہر سندری نے موقعہ پاکر پھر یہ بات اٹھائی مگر نوازن نے سنجیدگی سے کبھی اس پر غور نہیں کیا۔

ہر سندری کو اپنی اس تجویز کے متعلق نوازن کو بے فکر دیکھ کر ذرا بھی غم نہ ہوا۔ شوہر کی اس لاپروائی سے اس کے جی میں مسرت ہی پیدا ہوئی۔ نوازن کی محبت پر اسے اٹل یقین ہو گیا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اس کی اپنے سوامی کے بیاہ کی خواہش بھی تیز تر ہوتی گئی۔ اس نے اپنے اس خیال میں کامیابی حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

دوسری طرف نوازن کے روبرو جتنی استقامت سے یہ تجویز پیش کی جاتی وہ اسی قدر اس پر عمل پیرا ہونا غیر ممکن محسوس کرتا۔ اور دل میں اس خیال سے اجتناب کے جذبات بیدار ہوئے۔ عام طور پر گھر کی چوکھٹ پر حقہ گڑگڑاتے ہوئے یہ جان پڑتا جیسے اس کے قدیمی —— واداہ پرداداکے مکان میں بچوں کے ہنسنے اور رونے کی خوش آئند آواز گونج رہی ہے اور ان کی مسرت زا مسکراہٹ سے گھر میں چاروں طرف ضیا پاشیاں ہو رہی ہیں۔

نوازن کا دوسرا بیاہ کرنے کے متعلق اپنی تمام کوششوں میں ناکامی دیکھ کر ہر سندری مایوس ہو گئی۔ اور اس نے نوازن سے یہ تذکرہ بیان کرنا ہی بند کر دیا۔ مگر اس کی اس کیفیت کا نوازن پر الٹا اثر ہوا بلکہ دوسرے

بیاہ کی خواہش دن بدن بیدار ہونے لگ گئی۔ آخر کار مجبور ہو کر اس نے بذات خود ہر سندری سے اس کا ذکر چھیڑا۔ اس نے کہا ——— تم جو مجھے بار بار دوسرے بیاہ کے لئے اصرار کرتی ہو۔ کیا میں اس ضعیفی کے عالم میں کسی دوشیزہ سے بیاہ کر کے اسے خوش رکھ سکوں گا۔

اپنے سوامی کو آج اس حد تک مجبور دیکھ کر ہر سندری خوشی کے لہجہ میں بولی ——— آپ کو اس کی فکر ہی کیا ہے؟ یہ سب کچھ میں کر لوں گی اس کا بوجھ مجھ پر ڈال دیجئے۔

کہیئے کیئے اس اولاد سے محروم دیوی کی آنکھوں میں ایک غیر جلال نوخیز ننھا نازنین کے ماہتابی چہرہ کا دلکش عکس منعکس ہو گیا۔ جس کی محبت اس کے رگ وریشہ میں کا سرما ہو گئی تھی۔

نوازن بولا ——— مجھے دفتر جا کر کام کاج کرنا ہوگا تمہاری اور تمہارے گھر کے کام کی دیکھ بھال کرنی ہوگی بھلا اس چلبلی شباب میں سرشار نازنین کی عالم گفتار سے لذت یاب ہونے کے لئے کہاں سے وقت لاؤں گا۔

یہ سن کر ہر سندری نے کہا ——— آپ اس کا بھی فکر مت کریں۔ جب نئی دلہن گھر میں آئیگی تو اس کے لئے فرصت مل جائے گی پہلے دلہن لاؤ تو سہی پھر میں جا دوں گی کہ تمہارا کام کاج کہاں ہے میں کہاں ہوں۔ اور بذات خود تم کہاں ہو! پہلے ہی کیوں خائف ہو رہے ہو!

نوازن بابو نے ہر سندری کے اس سوال کا جواب دینا مناسب خیال نہ کیا صرف مسکراتے ہوئے اس کے متکبرانہ انداز میں گورے گورے رخساروں پر جھینپ

تندرستی کے دوبارہ عود کرنے سے قدرے سرخی جھلک رہی تھی۔ ایک ہلکی سی چپت رسید کر کے اس سلسلہ گفتگو کو منقطع کر دینا مناسب خیال کیا۔

(۲)

ایک ماہ میں ہی نوازن بابو کا بیاہ ہو گیا۔ اس نئی دلہن کا نام شیل بالا تھا نوازن نے جب یہ نام سنا تو خیال کیا ——— واہ! نام تو بڑا دلکش ہے صورت بھی بڑی بھولی بھالی اور دلربا ہے اس کا جی اپنی نئی دلہن کو دیکھنے کے لئے دل و جان سے مچلنے لگا۔ مگر برا ہو اس شرم کا جو اس کے راستہ میں سنگِ راہ بنی ہوئی تھی۔ اور اسے دلی خواہشات کی تکمیل سے سازگار نہیں ہونے دیتی تھی ——— ہر سندری نوازن کو سکڑتے ہوئے دیکھ کر دل ہی دل میں مسکراتی اور اس کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر کہتی تھی ——— آہ! ذرا تو ٹھیر لو۔ بھاگتے کہاں ہو؟ معصوم بیچاری کہیں کاٹے تو نہیں کھاتی!

نوازن شرمسار ہو کر گھبرائے ہوئے کہتا ——— چھوڑ دو! چھوڑو تو سہی آتا ہوں ابھی آتا ہوں۔ ایک کام کر آؤں

ہر سندری ایک بھی نہ سنتی راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی۔ اور کہتی۔ بس آج آپ دھوکہ دیکر نہ جا سکو گے

مجبور ہو کر نوازن وہاں بیٹھ جاتا۔ مگر بڑا منفعل اور شرمسار زمین پہ آنکھیں جھکائے ہوئے ذرا بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا۔

ہر سندری کہتی ——— واہ! آپ عورت ہیں یا مرد۔ کیا دوسرے کی لڑکی اسی لئے بیاہ کر لائی جاتی ہے کہ اس کی طرف متوجہ ہو کر بھی نہ دیکھیں؟ یہ کہہ کر شیل بالا

کو زبردستی کھینچ کر نوازن کی بائیں سمت بٹھا دیتی اور اپنے ہاتھوں سے اُس کا گھونگھٹ الٹ کر نوازن سے کہتی: "دیکھو تو سہی۔ شیلا نے کیسی ماہتابی صورت پائی ہے ——"
کسی دن ہرسندری دونوں کو اسی انداز سے ایک دوسرے کے قریب بٹھا کر خود کسی خاص کام کے بہانے فوراً باہر نکل جاتی۔ اور کواڑ بند کر دیتی لیکن اندر بیٹھے ہوئے نوازن یہ خیال کرتا تھا۔ کہ بالضرور دروازے کی کسی نہ کسی درز سے تماشا دیکھنے کی خواہش سے چشم نمائی کر رہی ہوگی اسی شبہ میں وہ اپنی نئی دلہن کی طرف متوجہ ہونے کا حوصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ بلکہ بے فکری سے نیند کا بہانہ کر کے چارپائی پر دراز ہو جایا کرتے تھے اور دوسری طرف شیل بالا بھی اپنا گھونگھٹ لٹکا کر شرمساری سے اپنے جسم کو بالکل تھوڑی سی جگہ میں سکوڑ کر گٹھڑی کی مانند ایک طرف پڑی رہتی تھی۔

آخرکار اس معاملہ میں رسائی نہ پا کر ہرسندری نے ساری دوڑ دھوپ بند کر دی مگر اس کا اسے شمہ بھر بھی افسوس نہ ہوا۔

ہرسندری کے اس طرح بے فکر ہو جانے سے نوازن کے دل میں خود بخود چلبلاہٹ ہونے لگی۔

انسان کا دل بھی ایک تعجب خیز شے ہے جب اسے خود بخود کوئی گوہر مل جاتا ہے تو وہ اسے الٹ پلٹ کر اچھی طرح دیکھتا ہے اور دوسروں کو دکھا کر پرکھتا ہے مگر جب اسکی کوئی گمشدہ شے مل جاتی ہے تو پہلے پہل اسے دیکھ کر بھی متحائف ہوتا ہے

میکرن کمپنی کے ہیڈ کلرک نوازن چندر کی بھی یہی حالت تھی درحقیقت ایک ناواقف خاتون کے ساتھ تنہائی میں ملنے کا اسے پہلے ہی موقعہ ملا تھا پہلے بیاہ کے وقت اسکی عمر بہت کم تھی جب جوانی میں داخل ہوئے تو ہرسندری اسکی پرانی واقف کار

لڑکی تھی۔ اس لئے اپنی اپنی گرہستی زندگی میں اس کے ہمراہ کبھی تنہائی میں بیٹھنے اور بات چیت کرنے سے جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔

جس بھنورے نے پکے اور شیریں آموں سے لدے ہوئے کشمیر میں ہی عالم تیر دیکھا ہو۔ اور جسے کبھی شہد کی تلاش میں کبھی مارے مارے بھٹکنے کی ضرورت نہ پڑی ہو اسے تھوڑی سی شیرینی میں لذت نہیں ملتی۔ اسے موسم بسنت پر کھلے ہوئے پھولوں کے کنج میں چھوڑ دو اور پھر دیکھو کہ نیم و گلاب کی کلی کے نزدیک پہنچ کر اس پر کونسی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ وہ اس کے چاروں طرف کامل بے بسی سے بھنبھناتا ہوا پرواز کرتا ہے۔ ایک لمحہ بھر وہاں بیٹھکر پھول کے رس کی نازک سی بوند لیتا ہے مگر کیا وہ اس سے تسکین حاصل کر لیتا ہے نہیں نہیں وہ پھر اس پر پرواز کرتا ہوا پروں کی دلفریب جھنکار سے راگ الاپنا شروع کر دیتا ہے۔

لڑازن نے پہلے تو اپنی نئی دلہن شیل بالا کیلئے الٹے رنگ برنگی پوشاک سے ملبوس موم اور بلور کی گڑیا۔ کبھی کوئی عطر کی شیشی کبھی عمدہ مٹھائی، کبھی کوئی پھل اور ہر سندری کی آنکھ بچا کر چپکے سے اس کو دینا شروع کر دیا۔ اور ہر سندری سے چھپ چھپکر اس کے پاس آنے جانے لگا۔ ایک دن ہر سندری نے موقعہ پا کر گھر کے کام سے فراغت کے بعد شیل بالا کے کمرہ کے سوراخ سے جھانک کر دیکھا دونوں بڑی خوشی سے چارپائی پر بیٹھے ہوئے آہستہ آہستہ تاش کھیل رہے ہیں اس نے خیال کیا ــــ واہ بڑھاپے میں بھی ایسے کھیلوں سے لطف مل سکتا ہے؟

لڑازن بابو کھانا کھا کر کپڑے میں آفس کے بن ماسے باہر جاتے ہیں مگر سب کی نظر بچا کر دفتر کی بجائے چپکے سے نئی بہو کے کمرے میں جا کر تاش کھیلنے لگتے ہیں لیکن اس

فریب کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی جیسے کسی نے اچانک گرم گرم سلائی پھیر کر ہر سندری کی آنکھ پھوڑ دی ہوں تاہم اس کی تابش کو برداشت نہ کر کے ہر سندری کی آنکھوں سے آنسو بھاپ بن کر اڑ گئے۔

ہر سندری نے محسوس کیا۔ میں بھی تو اسے اس گھر میں لائی میں نے ہی ان میں بغاوت کرائی۔ اور میرے ساتھ ہی ان کا یہ غیر مناسب سلوک ہے جس طرح میں ان کی راحت میں خار کی طرح کھٹکتی ہوں۔

اسے کہا ہر سندری! شیل بالا کو خاص احتیاط سے گھر کا کام سکھانے لگی تو ماں نے یہ دیکھ کر منہ بناتے ہوئے ایک دن کہہ ہی دیا — یہ بیچاری ابھی چھوٹی ہے اس سے زیادہ محنت نہ کرایا کرو ساس کا جسم ابھی کمزور ہے۔

ہر سندری کی زبان پر جواب تو بڑا جلا کٹا آیا تھا لیکن پی گئی۔ اور سن کر خاموش ہو گئی اس دن سے اس نے مصمم ارادہ کر لیا اور بہن کو کسی کام میں ہاتھ نہ لگانے دیا لیکن شیل بالا یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اسے ہرگز منظور نہیں تھا۔ کہ ہر سندری نوکرانیوں کی طرح گھر کے تمام کام کاج کرے۔ اور وہ خود بیاہتا سوامی کے ساتھ ہنسی کھیلتی رہے۔ یا بیکار بیٹھی دنیا کے ہر ایک کام کیلئے دوسروں کا منہ دیکھتی رہے۔

ہر سندری اب پوری استقامت سے گھر کا کام کاج کرتی ہے اس میں ایک قسم کا غرور دکھائی دیتا ہے۔ وہ لاچاری اور مجبوری سے کام کرتی محسوس نہیں کرتی وہ مجھ میں یہ خیال کرتی ہے کہ میرے دونچے یا ہم نہیں کھیل رہے ہیں ان میں نے کیلئے خانہ داری کا بھارا بار اپنے سر پر لے لیا ہے

(۳۳)

ہائے آج وہ طاقت کہاں ہے جس کے بل پر ہرسندری نے اپنے جی میں یہ خیال کیا تھا۔ کہ وہ اپنے حیات بخش سوامی کے جذبات محبت کو ہمیشہ کیلئے قربان کر سکتی ہے۔ جس وقت اچانک ایک روز پورنماشی کی رات کو اسکی زندگی میں تلاطم بپا ہوا تھا جس نے دامن کے دونوں کناروں کو پانی سے تر کر ڈالا تھا۔ اب کیا تھا۔ اسوقت ہرسندری نے جو سخت ارادہ کیا تھا۔ اب سیلاب کے تھم جانے پر اس قول کے تحفظ اور اس خیال کے مصمم رہنے میں اسکو اپنی رگ رگ اور نس نس پر زور دینا پڑتا ہے۔

اس نے اپنے ایام مسرت میں یکایک حوصلہ مند ہو کر اپنے اقرار کو توڑ دیا اب اسے سنبھالنے کیلئے لا انداز زمانہ تک کی غلامی۔ لمحہ بہ لمحہ اور ساعت بہ ساعت کی تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اسے کشف ہوا کہ انسان کس قدر ضعیف ہے اور اس کی قوت برداشت کس قدر حقیر ہے۔

بے انداز زمانہ کے درد و کلفت سے لاچار اور مغموم ہرسندری نے اپنے آپ کو ہلالی چاند کی مانند ایک ہلکی سی لکیر خیال کر کے یہ سوچا تھا۔ کہ میں دنیا میں ہر پہلو سے بے قیمت اور حقیر ہوں۔ اس پُر فریب دنیا میں میرا کچھ بھی نہیں ہر طرح میں اپنی زندگی کو ختم کر سکتی ہوں۔ لیکن جب آہستہ آہستہ اس کے جسم میں طاقت آئی اور اسی طرح خون موجزن ہوا تو اس کے دل میں کسی طرح سے ایک نشہ آ کر لاحق ہو گیا۔ اور اس بے آہنگی سے کہنے لگا اگر تو نے اپنے حقوق کو چھوڑ دیا ہے تو مجھے کیا؟ میں تو اپنے حق سے دستبردار نہیں ہو سکتی

ہرسندری نے جس روز پہلے پہل اپنی بری حالت کا احساس کیا اسی دن اس

نے نوازن اور شیل بالا کو اپنی خوابگاہ میں چھوڑ کر خود علیحدہ کمرہ تنہائی میں سونا شروع کر دیا۔ آٹھ برس کی عمر سے اس گھر میں آ کر اس نے جس بستر پر آرام کیا تھا کچھ چالیس سال بعد اس کو اس نے ہمیشہ کیلئے چھوڑ دیا۔

وہ سہاگن دیوی آج اپنے نازک دل پر ایک ناقابل دکھ کا بوجھ لئے ہوئے اپنی قسمت کے بستر پر آ کر دراز ہو گئی۔ اس وقت پڑوس کے مکان میں کوئی منچلا عیاش نوجوان بڑے سریلے لیکن پُر درد انداز میں فراق کی لے میں ایک راگ گا رہا تھا۔ قدرے مٹیر کہہ آہ ۔ ہا ۔ واہ ۔ واکہہ کہہ کر گویئے کی کمالیت پر تعریفی نعرے لگا رہے تھے

اس چاندنی رات میں اس کا وہ گیت ارد گرد کے گھروں میں بھی کچھ بُرا نہیں لگتا تھا۔ اس وقت چنپی رشیل بالا کی خواب اور آنکھیں نیند کے خمار میں جھپکی جا رہی تھیں۔ اتنے میں نوازن نے اس کے کان کے قریب منہ لیجا کر ملائمت سے کہا۔ پیاری

نوازن عہد حاضرہ کے شاعروں کی لذت افروز شاعری سن رہا تھا عالم شباب کی ترنگ کافی عرصہ سے اس کے کلیجہ میں دبی ہوئی تھی۔ اس وقت موقع پا کر بیدار ہو اٹھی۔ اس سے قبل جذبات محبت کو بیدار کرنے والا کوئی آدمی موجود نہ ہونے سے وہ خشک ہو گیا تھا اور نوازن کو یہ خیال بھی نہیں تھا۔ کہ انسانی ذہن میں بلندی و پستی کا یہ عالم پیدا کرنیوالی قوت اسی طرح خواب آور ہی رہتی ہے۔

صرف نوازن ہی نہیں بلکہ ہر سندری کو بھی ایک تکلیف کا احساس ہونے لگا آہ! یہ کیسی تکلیف ہے! کیسی کشمکش ہے ہم پہلے تو کبھی اس کا احساس نہیں ہوا جب وہ میرے ساتھ بات چیت کیا کرتے تھے۔ گھنٹوں خلیہ میں باتیں ہوتیں اس وقت تو ایسی خواہش بھی بیدار نہیں ہوئی۔ دراصل یہ ان کی خوابیدہ محبت ہے جو اس وقت تک

میرے خانۂ دل میں بجھے ہوئے چراغ کی مانند خاموش تھا۔ لیکن اب روشن ہو کر میرے

میرے کائنات دل میرے بخت بیدار میری روح اور جسم کو جلا رہا ہے۔

آج ہر سندری کو علم ہوا کہ ازدواجی زندگی کا احساس اور لذت بھی کوئی شے ہے

وہ عرصہ بیس سے اس رانی مرلیہ سے دور تھی ملنے کے بدوں اسکی زندگی اجیرن تھی۔

وہ اب تک تنک اتیل اور لکڑی کے کھیل میں مصروف رہی ہے اس نے زندگی کے

بیش قیمت جوہر کا خیال تک نہیں کیا اس نے زندگی کے کتنے سال گھر میں نوکرانیوں

کی مانند گزارے مگر آج ایک حقیر بچی اس کی خوابگاہ میں ایک پوشیدہ اور بے اندازہ خزانہ

کا قفل کھول کر رانی بنی بیٹھی ہے۔ وہ جو اتنے دنوں سے اپنے گھر کی مالکن تھی دودھ میں

گری ہوئی مکھی کی طرح نکال کر باہر پھینک دی گئی ہے بلاشک نوکرانی بھی عورت ذات

ہے مگر رانی بھی تو خاتون ہی ہے۔ اپنی قسمت ہر ایک عورت نوکرانی اور دوسری رانی بن

جاتی ہے۔ اگر آج شیل بالا کو بھی حیات نسوانی کی حقیقی مسرت حاصل نہیں تھی اس

تار دولت اور عظمت پا کر اس کے جی میں کسی اور شے سے محبت کیلئے جگہ نہ رہی

تالاب کی طرف بہتے ہوئے سمندر میں اپنی ہستی کے کھو جانے پر دریا کا درجہ کافی بڑھ

جاتا ہے۔ لیکن اگر سمندر سیلاب کی کشش سے دریا کی طرف راغب ہو اور دریا

سمندر کی طرف نہ بہ کر دوسری سمت بہنے لگے تو اس کی فطرت متبدل ہو جاتی ہے

دنیا اپنی ساری عزت ساری قسمت لیکر شیل بالا کی طرف راغب تھی اسلئے شیل

بالا کا تکبر اور بھی بڑھ گیا اور دنیا کی محبت اسکے دل پر جاگزین ہو گئی۔ اس نے سمجھا کہ ساری

کائنات میرے لئے ہی عالم ظہور میں آئی ہے میں کسی کیلئے نہیں بنائی گئی۔ وہ حالت غرور

کی انتہائی کیفیت تھی۔ مگر میں ذہنی استوار کا نام کبھی نہیں پایا جاتا۔

(۴)

ایک دن گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی - چاروں طرف اس قدر تاریکی مسلط تھی کہ گھروں میں چراغ کے بدوں چلنا ممکن نہیں تھا - باہر چھما چھم بارش ہو رہی تھی بدقسمت ہرسندری اپنی تنگ خوابگاہ میں جنگلے کے قریب خاموش بیٹھی تھی -

استے میں نوازن چوروں کی مانند دبے پاؤں آ کر اس کے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہو گیا - اور سوچنے لگا - آگے بڑھ کر کمرہ میں گھس جاؤں یا الٹے قدم واپس چلا جاؤں - ہرسندری نے بھی اسے دیکھ لیا لیکن خاموشی سے بیٹھی رہی -

تھوڑی دیر کے بعد یکایک نوازن کمرے میں آ پہنچا - اور لمبی آہ بھر کر بولا - "تمہیں یہ تو علم ہے کہ میرے سر پر بڑا قرض ہے ساہوکار تنگ کر رہے ہیں کچھ زیور دو تو گروی رکھ کر ادھار چکا دوں - جلد ہی روپیہ دیکر چھڑا لوں گا -

ہرسندری اب بھی چپ رہی - اس نے کوئی جواب نہ دیا - نوازن ملازموں کی طرح کھڑا رہا - تھوڑی دیر بعد بولا —— آج کیا کچھ نہیں ہو سکتا ؟

ہرسندری نے کہا - نہیں

یہ سن کر نوازن کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی - اس نے پھر کہا - تو پھر کہیں جا کر انتظام کروں ؟"

یہ کہہ کر نوازن چلا گیا - ہرسندری سمجھ گئی - کہ کس کا ادھار دینا ہے اور دن تنگ کرنے والا ساہوکار کون ہے - اور زیور کس کے پاس گروی رکھے جائیں گے وہ جانتی تھی کہ نئی دلہن کل رات اپنے شوہر کو مجبور کر رہی تھی - کہ اس کے پاس جو زیورات کا ڈبہ بھرا پڑا ہے کیا اس میں سے مجھے کچھ بھی پہننے کو نہیں ملے گا -

نوازن کے چلے جانے کے بعد ہر سندری اٹھی اور لوہے کا بکس کھول کر اس نے سارے زیور باہر نکالے پھر شیل بالا کو بلا کر پہلے تو اسے اپنے بیاہ کی بنارسی ساڑھی پہنائی - اسکے بعد سر سے لیکر پاؤں تک گہنوں سے لاد دیا اور اچھی طرح اسکے بالوں کو سنوار کر اسے لیمپ کے قریب لائی اس کے چہرہ کی سرخی اور دراز زلفیں عنابی رخساروں پر لہراتے ہوئے دیکھ کر محظوظ ہو اٹھی

شیل بالا اس طرح زیورات سے ملبوس ہو کر چھم چھم کرتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی - اس کے بعد ہر سندری سوچنے لگی - افسوس اکسی وقت مجھ پر بھی یہ عالم تھا - اسی طرح خوشنمائی شباب اور رعنائی اس وقت کبھی مجھے کسی نے یہ نہ بتایا - کہ میرے لئے یہ دن بھی آنے والے ہیں - افسوس مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ دن کہاں گئے اور یہ کہاں سے آگئے -

شیل بالا سونے چاندی اور ہیروں سے لدی ہوئی اپنی خوابگاہ میں چلی گئی - اس نے ذرا بھی نہ سوچا کہ ہر سندری نے اسے کتنے روپے کا مال دیا ہے وہ سمجھتی تھی - کہ ہر چہار اطراف سے دولت اور خوشی بخشی اور غلامی اپنے آپ اسکے قریب آجائیں گے کیونکہ وہ شیل بالا ہے اور اس کا مالک اسے شیلا کہہ کر پکارتا ہے -

(۵)

کئی لوگ رات کو سوتے ہوئے ہی اٹھ کر بڑی خوشی سے دشوار راستوں سے پار ہو جاتے ہیں کافی لوگوں کو بیداری میں بھی حیرت ہوتی ہے وہ مشکلات کی پگڈنڈی پر بے فکری سے بڑھتے چلے جاتے ہیں - اور ان کی آنکھ اس وقت کھلتی ہے - جب وہ ظلمات کے گڑھے کے نزدیک پہنچ

جاتے ہیں۔ اس وقت ان سے کچھ بن نہیں آتا۔ بالکل ایسی عالت نوازن بابو اور ان کی پیاری دلہن کی تھی۔

شیل بالا نے ان کی زندگی میں ایک عجیب انقلاب بپا کر ڈالا۔ وہ روز روز نہ سے بیش قیمت اشیا منگا کر فضول اکٹھی کرتی رہتی تھی۔ اس نے صرف . . . .

نوازن کی انسانیت اس کی ماہوار آمدن اہر سندری کی خدمت اور اسکی قسمت اور زیور اور لباس پر ہی اپنا اختیار نہیں جمایا۔ بلکہ نوازن کے خزانہ سے کافی کچھ خاموشی سے حاصل کر لیا۔ چند ہمیلیاں گم ہو گئیں۔ نوازن نے سوچا کہ اپنی آدھی تنخواہ سے اس کمی کو پورا کر دیا جائے گا۔ لیکن اگلے ماہ کی تنخواہ ہاتھ میں آنے کی ہی دیر تھی کہ وہ بھی اسی طرح ختم ہو گئی۔

آخر ایک دن راز فاش ہو گیا۔ نوازن کی چوری پکڑی گئی۔ نوازن بابو اس دفتر میں کئی پشتوں سے نوکر تھے۔ افسر ان پر بڑا مہربان تھا۔ اس لئے اس اپنی فراخدلی سے انہیں یہ روپیہ پورا کرنے کیلئے دو دن کی مہلت دیدی

بابو نوازن چند کو بذات خود سمجھ نہیں آتا تھا۔ کہ وہ اس محدود عرصہ میں دو اڑھائی ہزار روپیہ کی کمی کس طرح پوری کر سکتا ہے۔ اس نے لاچار ہو کر پاگلوں کی طرح آکر ہر سندری سے کہا — افسوس! بیاہ ہو گیا

ساری کہانی سن کر ہر سندری کا رنگ فق ہو گیا۔ نوازن بولا — جسقدر زیورات تمہارے پاس ہوں جلدی نکال دو۔ جس سے میں کسی نہ کسی طرح اس مصیبت سے نجات پا لوں.

ہر سندری بولی — زیور تو میں نے سب بہو کو دے دیے ہیں

اب میرے پاس دھرا ہی کیا ہے۔

تواذن نے مایوس ہو کر متفکرانہ انداز میں کہا ——— چھوٹی بہو کو تم نے کیوں دے دیا؟ تمہیں کس نے کہا تھا۔ کہ سارے زیور چھوٹی بہو کو دیدو؟

ہرسندری نے اس سوال کا جواب دیکر کہا ——— اگر میں نے اسے زیور دے دیئے ہیں تو کیا ہی بگڑا ہے۔ وہ بھی تو یہاں ہی ہے۔ کہیں چلی تو نہیں گئی اس سے جا کر لو۔

تواذن نے مسرور ہو کر کہا ——— اگر تم کسی طرح اس سے گہنے مانگ تو لے آؤ۔ مگر تمہیں میری قسم اسے یہ نہ کہنا کہ مجھے اس کے زیور کی ضرورت ہے۔

یہ سن کر ہرسندری کو بڑا افسوس ہؤا۔ اس نے اظہار تنفر سے کہا۔ "کیا آپس میں کوئی فریب کرنے کا وقت ہے؟ چلو میرے ہمراہ چلو۔

یہ کہہ کر اس نے اپنے سوامی کو ہمراہ لیا۔ اور چھوٹی بہو کے کمرہ میں آ کر اس کو حادثہ سے آگاہ کیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ——— بولی مجھے تو کوئی علم نہیں ہے

دنیا کے تفکرات سے اُسے کوئی سروکار تو تھا نہیں اسے کوئی اس قسم کی باتیں نہیں کہتا تھا۔ سب کو یہی فکر رہتی تھی۔ کہ جس طرح بھی ہو سکے اُسے آرام سے رکھا جائے تو پھر اب اسے کیوں دکھ دیا جاتا ہے یہ کتنا

اندھیرے یہ کیسا ہے

شیل بالا کی خشک مزاجی دیکھ کر نوازن اس کے قدموں پر گر کر بولا۔

جس طرح بھی ہو مجھے بے عزتی سے بچاؤ ــــــ قید ہونے سے میری حفاظت کرو۔

مگر اس کا جواب تھا ــــــ مجھے تو کوئی خبر نہیں میں تو اپنے گہنے کبھی نہ دوں گی "

نوازن کو پتہ چلا۔ کہ یہ پُرفریب تتلی تو فولادی صندوق سے بھی زیادہ سخت ہے۔ مصیبت کے وقت اپنے سوامی کی لجاجت دیکھ کر ہر سندری غصہ اور نفرت سے پُرجوش ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور شیل بالا سے اس کے صندوق کی چابی زور آزمائی سے چھیننے لگی۔ مگر شیلا بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھی۔ اس نے چابیوں کا گچھا دیوار سے اٹھا کر تالاب میں پھینک دیا۔ یہ حادثہ دیکھ کر نوازن مبہوت اور مایوس ہو گیا۔ ہر سندری نے کڑک کر کہا۔ تالا کیوں نہیں توڑ ڈالتے۔

شیل بالا بولی ــــ اگر تالا توڑ کر میرے زیور نکالے تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گی

نوازن نے گھبرا کر کہا ــ اچھا میں اس کا کوئی اور انتظام کرتا ہوں"

یہ کہہ کر وہ فوراً ہی باہر چلا گیا۔ اور دو گھنٹے کے بعد اپنی خاندانی حویلی کو اڑھائی ہزار میں فروخت کر کے گھر چلا آیا۔ قید سے تو بچ گیا۔ مگر نوکری سے تو ہاتھ دھونا ہی تھا۔ نوازن بابو کی جائیداد دو عورتوں تک ہی مخصوص

تھی الٹا میں سے چھوٹی بہو اس غم میں لاچار ہو کر بیٹھ ساکت سی رہا کرتی تھی۔

حویلی کے ہاتھ سے چلے جانے کے بعد نوازن بابو نے اپنے ایک دوست کی فراخدلی سے ایک چھوٹے سے گھر میں منہ چھپانے کیلئے جگہ پائی۔ کیونکہ بیکاری کی وجہ سے ان کو کرایہ ادا کرنے کی بھی ہمت نہیں رہی تھی۔

(۶)

اور تو ہوا سو ہوا چھوٹی بہو کے غصہ اور ناراضگی کی حد نہ رہی وہ کسی طرح یہ سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ کہ اس کے سیاہ بخت سوامی میں اب ہمت نہیں کہ اس کے لاانتہا اخراجات کا بار اٹھا سکے وہ بات بات پر بگڑ کر یہ کہتی اگر میرا خرچ اٹھانے کی طاقت نہیں تھی۔ تو میرے ساتھ بیاہ ہی کیوں کیا اس چھوٹے سے مکان کی بالائی منزل پر دو ہی کمرے ہیں انہیں سے ایک میں شیل بالا اور نوازن سوتے ہیں۔ اور دوسرے میں ہرسندری رہتی ہے۔ شیل بالا بار بار بگڑتی ہے۔ کہ ہم دن رات آٹھوں پہر خوابگاہ میں ہی نہیں مر سکتے۔

نوازن اسے یہ کہہ کر چھو ٹالا سا دے رہا ہے کہ میں لگی اور اچھے گھر کی تلاش میں ہوں ملنے پر اس میں جا رہیں گے۔

شیل بالا اب اپنے پہلے ہمسایوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ ایک بار ان کی عورتیں نوازن بابو کی مو ستریوں سے ان کی اس مصیبت میں ہمدردی کے اظہار کیلئے آئی تھیں۔ لیکن شیل بالا نے دروازہ بند کر

لیا۔ وہ بیچاری گالی مجبور ہو کر واپس چلی گئیں۔ جب ہر سندری نے کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔ تو اس نے بگڑ کر رو کر۔ بھوکی رہ کر ہسٹریا کا دورہ کر ڈالا۔ اور نیم جان ہو کر پڑی رہی اس قسم کی افسوسناک وارداتیں اب اس گھر میں عموماً ہوا کرتی تھیں۔

آخر کار اس دن رات کی آہ وزاری اور تکرار سے شیل بالا کی صحت دن بدن بگڑنے لگی۔ حمل گر گیا۔ لاچار نوازن نے ہر سندری سے دست بستہ ہو کر کہا۔ جس طرح بھی ہو سکے شیل بالا کی جان بچاؤ۔

بدقسمت خاوند پرست ہر سندری نے اپنی سوت کی تیمارداری میں دن رات ایک کر دیا۔ شیل بالا کی عادت پہلے ہی چلبلی تھی۔ بیماری سے اور بھی چڑچڑی ہو گئی۔ وہ بات بات پر بگڑ کر اسے برا بھلا کہتی۔ مگر ہر سندری۔ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی کوئی جواب تک نہ دیتی تھی۔

شیل بالا کسی طرح کچھ بھی کھانا پینا نہیں چاہتی تھی۔ جس برتن میں اسے کچھ کھانے کو دیا جاتا اسی کو گھما کر پھینک دیتی۔ اگر کچھ مانگتی تو بخار میں ہی کچے آملہ کی کھٹائی بھات میں ملا کر کھلاؤ۔ اس کا تو اس حالت میں پرہیز لازم تھا۔ جب سے حسب خواہش کھانا نہ لیتا۔ تو رو پیٹ کر گھر سر پر اٹھا لیتی۔

ہر سندری اسے ہمیشہ میری لکشمی۔ میری پیاری۔ میری بہن۔ جیسے ملائم الفاظ سے بلاتی۔ اور بچوں کی مانند پیار کرتی تھی۔ مگر ہر سندری کی ہمت بھر کوشش کے بعد بھی شیل بالا اپنی بدپرہیزی سے بچ نہ سکی دنیا کی ساری خوش بختی۔ دولت، عظمت اور عزت حاصل کر کے بھی وہ بدبخت لڑکی

بے اندازہ مصیبت اور خلفشار کی حالت میں اپنی حقیر ناکام اور فضول زندگی کو قبل از وقت ہی تباہ کر بیٹھی۔

(۷)

نوازن بابو نے پہلے تو شیل بالا کی موت کے حادثہ کو بڑی عظیم مصیبت سمجھا لیکن آخر کار اس کا جی سنبھلتے سنبھلتے سنبھل ہی گیا۔ اور اس نے دیکھا کہ اس کی اسیری کی ایک زنجیر ٹوٹ گئی۔ اب اس غم میں اسے اچانک ہی آزادی کی مسرت حاصل ہونے لگی۔

کبھی وہ سوچتا تھا۔ کہ اس عرصہ تک وہ بڑا خواب دیکھتا رہا ہے جس میں بیداری میں ہی اس کی زندگی قدرے فضول اور بے معنی نظر آئی۔ اس نے سوچا ——— جس قید سے تب مجھے آزادی ملی ہے۔ کیا وہ شیل بالا میرے لئے کسی عظمت اور فخر کا باعث تھی۔ یکا یک ایک سرد آہ نکلی اور اس نے جواب دیا ——— نہیں تو تمہاری زندگی میں ایک پھانسی کا پھندا تھا۔ اور تمہارے ایام حیات کی رفیقہ ہر سندری ہے۔ سوچنے پر پتہ چلا کہ وہی تو دنیا میں اس کی مکمل کائنات ہے۔ اسی نے تو اسے زندگی کے رنج و راحت میں اس کے خیالی معبد اپنا کامل تسلط پایا ہوا ہے لیکن اب اس سے بھی جدائی کا ایک ایسا سبب پیدا ہو گیا ہے۔ جس طرح کوئی ادنےٰ اسی چمکدار اور خوشنما اور بے رحم چھری لا کر اس کے جگر کے دو ٹکڑے کر دیئے گئے ہوں۔

ایک روز جب آدھی رات کو سارا عالم خواب کے نشہ میں پاؤں پسارے

سو رہا تھا۔ فوازن آہستگی سے ہر سندری کی خوابگاہ میں پہنچا اور اپنے پرانے ڈھنگ سے پُرانے بستر کی بائیں طرف اپنا قبضہ جما کر سو رہا۔ مگر آج اس کے سونے میں راز کی جھلک نہیں بلکہ کچھ وزدیدگی کا عنصر پایا جاتا ہے۔

ہر سندری بھی اسی چارپائی پر خاموش پڑی رہی۔ وہ بھی فوازن سے جیسا وہ پہلے کسی وقت جس طرح ایک دوسرے کے قریب سویا کرتے تھے۔ آج بھی سو رہے ہیں۔ لیکن آج ایک مردہ لڑکی کی لاش ان کے درمیان پڑی تھی جو انہیں باہم متفرق کر رہی تھی۔ مگر اسے کوئی ہٹا تک نہیں سکتا تھا۔

کیفِ محبت

میری کہانی کا موضوع قدیم برہمن خاندان ہے۔ آرام و آسائش سے زندگی بسر کرتے کرتے سر کے بال تک سفید ہوگئے۔ دھرم کرم اور اخلاق و خیال سے جسم ناعزتر ہوگیا۔ اب عدالت کی پریکٹس بھی نہیں ہو پاتی۔ ایک طرف عبادت و ریاضت اور دوسری طرف قانونی مشورات دیتا۔ ان دونوں کی چپقلش پر غور کرتے ہوئے بے شماری سے زمانہ گزرتا چلا جارہا ہے کسی طرف بھی انھوں نے اپنا پاؤں پھسلنے نہ دیا۔ اسی قسم کا یہ باخلاق سناتنی گھرانا رہا ہے اگر کوئی مخلِ دخل انداز ہوتا۔ تو اس کی پوری قوت سے مخالفت کی جاتی۔ اس باخلاق برہمی خاندان میں مشکل تر مراحل نے وجود پایا۔ ہمارے فرد مجلس کو لیکر اس کا نام تھا امبیکا چرن۔ اسی نام میں خاندانی دھرم کی جو چھاپ ہے۔ اس سے اس کی ذہنی کیفیت مختل ہوا گئی۔ اور بدل کر اپنا نام رکھا ــــ امبیک کمار

امبیک کی صورت میں نرالی کشش تھی۔ گورا رنگ۔ لمبا جسم۔ بڑی بڑی آنکھیں تیز ناک۔ نوجوانی بھی اسی انداز کا جس طرح وہ متعامل سے برسرپیکار رہنے کو ابھار رہی ہے لڑکے کے الحاد سے اس کا باپ امبیکا چرن بالخصوص محزون ہوگیا۔ مگر اسے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ کیونکہ وہ تو خوش طبع منصف مزاج اور پھر تھا بھی وہ اس کا بڑا لڑکا۔ بوڑھا انصاف پسند علم منطق کا شہسوار ہر طرف سے گھرے ہوئے یا محیط کل ایشور کی ہستی پر معترض ہوا کرتا تھا۔ ہندو سماج مسکرا کر کہتا

چوہا ہضم کرلیا۔ مگر پیٹ پر ابھارا نہ آنے دیا۔ دھارمک اخلاق کے پنجرے سے مذہبی اخلاق اعتقاد کے پرندے کو آسمان پر اڑا دینے سے فرقہ وارانہ تسکین نہیں ملتی۔ لیکن اسے اچرن بات بات میں مخالفت کیا کرتا تھا۔ گھر کی ہر سمت بوڑھے ماں باپ کی چہل پہل اپنی دلکش آواز ہر ایک قسم کی ملحدانہ باتیں بار بار باپ کے کانوں تک پہنچائیں۔ اس سے گھر کے بڑے بابو بڑے متاثر ہوئے وہ انہیں ان سنی کر دیتا۔ یہاں تک کہ جو آدمی دوستانہ انداز میں خبر دینے آماد وہ اسے فوراً ہی دروازہ سے باہر چلے جانے کو چلا کہتے۔ جب تک جرم بالکل واضح ہو جاتا سماج موقع پانے کیلئے درگزر کرتا رہا۔ مگر آخر کار ابھیک اس قدر عظیم الشان غلطی کر بیٹھا۔ جس سے اسے اپنے جرم سے انکار مشکل ہو گیا۔

بھدرکالی اس کی خاندانی دیوی تھی۔ اس کا شہرہ عوام میں پایا جاتا تھا۔ ابھیک کا خاندان دیوی کی ناراضگی سے از حد خائف رہا کرتا تھا۔ ایک بار گھبرا کر اس کی عقیدت کو کم ثابت کرنے کے لئے عبادت کے کمرہ میں ابھیک کچھ اس قسم کی بداخلاقی کر بیٹھا۔ جس سے اس کا باپ غصہ میں بھر کر بولا —— نکل جا میرے گھر سے میں تیرا منہ نہیں دیکھنا چاہتا۔!

اس قدر سختی راسخ الاعتقاد براہمن کے خاندان میں ہی ممکن تھی، لڑکے نے ماں سے جاکر کہا —— ماں میں نے دیوی سے کئی بار روگردانی کی ہے۔ لیکن اس بار نا معلوم کیا ہو گیا۔ میں انہیں جانتا تھا۔ کہ کسی بھی دیوتا کا غضب اس قدر نمایاں ہوا اٹھتا ہے"

ماں نے آنسو پونچھتے ہوئے آنچل سے ایک نوٹ کھول کر دیا اور کہا۔

اس نوٹ کو میں نے از حد احتیاج پڑنے پر بھی اپنے کام پر خرچ نہیں کیا اسے اب تمہارے ہاتھ میں دیتی ہوں"

البیک کے متعلق ایک دو باتیں اور بھی کہی جاتی ہیں۔ اس کی زندگی میں دو اور الٹی قسم کے شوق پائے جاتے تھے۔ ایک تو مشینوں کے پرزوں کی مرمت اور دوسرا مصوری۔ اس کے باپ کی تین موٹر گاڑیاں تھیں مکینک کے اس کے ہی ذرائع تھے۔ اس کے علاوہ ان کا کلائینٹ کا تھا۔ موٹر کاروں کا کارخانہ وہاں وہ شوق سے کئی دن گزار چکا تھا۔

البیک مصوری سیکھنے گیا تھا۔ سرکاری آرٹ سکول میں چند یوم میں ہی اس کا یقین راسخ ہو گیا تھا۔ کہ کچھ دن اور سیکھنے پر وہ کامیاب ہو جائیگا۔

اسی لئے وہ اسی خیال کے تحت وہ اپنے آپ کو آرٹسٹ سمجھنے لگ گیا نمائش میں تصویروں کے نیچے اس کا تعارف عہد حاضرہ کے بہترین آرٹسٹ البیک کما مہ بنگالی لکھتا رہتا تھا۔ اسی قدر وہ جوش سے کہنے لگا میں آرٹسٹ ہوں۔ اسی دن لوگوں کے اذہان میں اس کی آواز پہنچنے لگی کئی لوگ اس سے متاثر ہو گئے۔ کئی شاگرد بن گئے۔ جن کو دیکھ کر کئی شاگردنیں بھی اکٹھی ہو آئیں اور اس گروہ کی ایک مخالف پارٹی بھی پیدا ہو گئی تھی۔

گردش کے آخری ایام میں البیک نے جو ایجادیں کیں وہ اسکے دولتمند باپ کی وجہ سے تھیں۔ آرٹسٹ کے نام کے بعد جو متنفر بادل برستا اسکے قطروں سے اس کا شہرہ بڑھتا چلا جاتا۔ اس کے ساتھ ہی وہ چند ایک امور کی ایجاد بھی کرتا تھا۔ اس سے اس کی ماں کی عقیدت کسی بھی صورت میں کم نہ ہوئی

شاگرد شاگردنیں آنکھیں پھاڑ کر بلند آہنگی سے اس کو آرٹسٹ کہتے ہیں۔ اور وہ آپس میں شک کرتے ہیں۔ اور دو ایک کو چھوڑ کر باقی سب حسد کرتے اور جلتے ہیں

ابھیک کی زندگی کے حالات طویل اور نمایاں ہیں۔ میلی ٹوپی۔ تیل سے سنے ہوئے بال نیلی نکر پہنے ہوئے واران کمپنی کے کارخانہ میں وہ ابتدا میں مستری گری کا اور پھر ہیڈ مستری کا کام کرتا رہا تھا۔ مسلمان خلاصیوں کے گروہ میں چار پیسے کے پراٹھے اور ویسا ہی شاستر دروھ گوشت کھا کر دن گذارتا تھا۔ لوگ کہتے وہ مسلمان ہو گیا ہے۔ وہ کہتا کیا مسلمان علیحدہ سے بڑا ہوتا ہے۔ جب ہاتھ میں چند پیسے ہوں گے تو پوشیدہ طور پر گھر واپس آکر اس دفعہ وہ مکمل طور پر مصور کی حالت میں جلوہ گر ہوگا۔

شاگرد اور شاگردنیں اکٹھی ہو گئیں۔ چشمہ لگائے نازآفرینیں اس کے سٹوڈیو میں عہد کی تہذیب سے مزین۔ بات چیت اور بحث مباحثہ کرنے لگے سگرٹوں سے کتنا ہی دھواں اڑا۔ اور تاریکی چھا گئی۔ ایک دوسرے کے متعلق باہم انگشت نمائی کرنے کے دوران گفتگو میں اشارات ہوا کرتے۔

دبھا اس گروہ سے بالکل الگ تھی۔ ایک دن کالج کے دروازہ کے پاس ابھیک سے اس کی گفتگو ہوئی تھی۔ ابھیک کی عمر اس وقت اٹھارہ سال کی تھی چہرہ جوانی کے خمار سے چمکتا تھا۔ اور اس کی لیڈی اس سے بڑی عمر کے لڑکے بھی قبول کرتے تھے۔

برہم سماجیوں میں رہ کر مردوں کے ساتھ ملنے کی جھجک دبھا میں نہیں تھی

مگر کالج میں اڑچن ہوا کرتی تھی - اس سے کبھی کسی طالب علم غیر مہذب انداز کی حرکت - اور مسکراتے ہوئے اشارے دیکھے جاتے تھے مگر ایک دن ایک شرارتی لڑکے کی کمینگی تک بندی کے انداز میں دکھائی دی یہ دیکھ کر ابھیک اس لڑکے کو وبھا کے پاس طلب عفو کے لئے لایا اور کہا ـــــــ "معافی مانگو"

معافی چاہتا بھی تھا - آخر کار اس نے جھک کئی باتیں سنائی دینے لگیں - وبھا کو لوگوں کی اس کانا پھوسی سے از حد ندامت اٹھانی پڑی مگر اس کے ساتھ ہی اس کے رونگٹے کھڑے والی مسرت بھی -

وبھا کی صورت خوشنمائی کے انداز سے بڑی دلکش تھی - جس کو کسی بھی طرح کی تشریح نہیں کی جا سکتی - ابھیک نے ایک روز اس سے کہا ـــــ بن بلائے لوگوں کے لئے رفیقوں کیلئے ہی ہوا کرتی ہے مگر تمہاری خوبصورتی دوسرے کے لذیذ کھانے نہیں بن سکتی وہ صرف مصور کا ہی حصہ ہے وہ لیونارڈوں کی کی تصویر سے مشابہت رکھتی ہے -

ایک بار کالج کے امتحان کے وقت وبھا نے ابھیک کو پھٹکار دی وہ چوکنا ہو گیا - وبھا نے اسے اپنی بڑی بے عزتی خیال کیا - اور کہا ـــــ تم دن رات صرف تصویریں ہی بناتے رہتے ہو ـــــــ پھر بھی امتحان کے پیچھے پڑے ہو "

یہ بات اچانک قریبی برآمدہ کے باہر گذرتے ہوئے وبھا کی ایک سہیلی نے سنی اور ایک شعر چست کر دیا -

البیک سے کہا۔ میں زبانی علم تو جانتا نہیں۔ میں تو صفر حاصل کرنے کا امتحان دینے چلا ہوں۔ میری مصوری سے تمہارے آنسو ٹپکتے ہیں اور تمہارے خشک آنسو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو بھی سوکھ جاتے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیوں نہ تمہارے پاؤں کے تلے اپنی آنکھیں فرشِ راہ کر دوں پارٹی کا لیڈر رہوتے ہوئے بدنام تو ہو ہی چکا ہوں۔

اسی مصوری کے متعلق دونوں میں بعد المشرقین تھا۔ دبھا البیک کی تصویروں پر توجہ بھی نہیں دیتی تھی۔ یہ درست تھا۔ اور لڑکیاں جب اس کی تلمکاروں پر اس کے لئے مجمع ہوتی تو اسے مالا پہنائیں اور عزت افزائی دکھاتیں۔ تو یہ دیکھ دبھا بے سمجھ نادم ہوتی۔ مگر تیز غصہ کی وجہ سے البیک کا دھڑکتا ہُوا دل دبھا کی نیک خیالی حاصل نہ کر پاتا۔ کئی لوگ اس کی تصویروں کو پاگل کا کام خیال کرتے۔ دبھا بھی اسی انداز سے اس کی ہر کاب ہو یہ اس کے لئے قابلِ برداشت نہیں تھا۔ صرف یہی خیال اس کو آتا تھا۔ کہ ایک دن البیک یورپ جائے گا۔ اس وقت جو مسرت کا نعرہ بلند ہوگا تو دبھا جی "جے مالا" لیکر حاضر ہوگی

دسہرہ کے دن کی صبح تھی۔ برہم مندر سے عبادت کر کے واپس آتے ہوئے دبھا نے اپنے گھر البیک کو بیٹھے دیکھا۔ اس کے پاس کاغذ میں لپٹا ہُوا ایک قلمی چہرہ تھا۔

دبھا نے دریافت کیا ـــــ "اچانک آپ یہاں کیسے؟"

ابھیک نے کہا — دوستی وجہ نہیں بناتی۔ مگر یہ تو مؤخر ہے مقدم خیال کے اظہار میں دوستی مانع آتی ہے اور جو وجہ ہے بھی اس پر شبہ نہ کیا جائے میں چوری سے آیا ہوں"

دبھا قریب پڑے ڈیسک پر جاکر بیٹھ گئی اور بولی — اگر ضرورت نہ ہونے پر چوری کرتے تو پولیس کو خبر نہ ہوتی؟"

ابھیک بولا — ضرورت کی "ہاں" تو روزانہ ہی مندر کے سامنے ہوتی ہے۔ دوسروں کی دولت پر ڈاکہ ڈالتا تو ہر ایک جماعت سے نیک خیال کیا جاتا ہے۔ ہم دھرم کو دیکھ کر بڑی ہوشیاری سے چلتے ہیں اور پھر ہم دیوتاؤں کی عزت کرتے ہیں۔"

"شاید کافی دیر سے بیٹھے ہو"

"یہ تو درست ہے۔ آج کل بیٹھے بیٹھے سائیکالوجی کی ایک مشکل ترین "پرابلم" کی دل ہی دل میں ادھیڑ بن کیا کرتا ہوں۔ لیٹے ہوئے سوچا کرتا ہوں۔ اور باہر سے دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے۔ رستم میں کچھ فراست بھی ہے۔ پھر بھگوان پر اعتقاد کی کیا ضرورت ہے۔ اس کی بھی رضاعت چاہتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بار بار تمہارے گھر آ کر اس ریسرچ کا کام مکمل ہو جائے گا"

وبھا نے کہا — اب تم میرے دھرم کو لیکر گفتگو کرنے لگے

ابھیک نے کہا — اس کی یہ وجہ ہے کہ تمہارا دھرم مجھے اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ ہمارے درمیان جو حد فاصل ہے۔ وہ بڑی زرخیز ہے۔ میں

معاف نہیں کر سکتا۔ تم میرے ساتھ بیاہ نہیں کر سکو گی جس پر تمہارا اعتماد ہے اس پر میرا یقین نہیں ہے۔ اسی میں عقلمندی ہے۔ مگر تمہارے بیاہ کرنے میں مجھے کوئی اڑچن نہیں ہوگی۔ تم ایک ناواقف کی مانند سچ جھوٹ پر اعتماد کرتی ہو"

تم ملحدوں کو تباہ کرنے کے لائق نہیں ہو۔ میرے دھرم کی یہی خصوصیت ہے۔ سب دیوتاؤں کی موجودگی میں تم ہی ایک میرے لئے ہست بالذات ہو۔ اس کو فراموش کرنے کی میرے دل میں ایک بھی خواہش جگہ نہیں پا سکتی"

دبھا خاموش بیٹھی رہی تھوڑی دیر بعد ابھیک بولا۔ تمہارا ایشور کیا میرے پتا کی مانند ہے۔ جس نے مجھے چھوڑ دیا ہے"

دبھا بولی۔۔۔۔۔ یہ کیا بک رہے ہو"

ابھیک جانتا تھا۔ کہ بیاہ نہ کرنے کا کیا سبب ہے وہ روزانہ دبھا سے بات چیت کرنا چاہتا ہے۔ لیکن دبھا خاموش کر ڈالتی ہے۔

زندگی کے ابتدائی ایام سے ہی دبھا ابھیک کے باپ کیلئے بیٹی کی مانند تھی۔ اس قدر محبت اتنی قدر عقیدت اس نے کسی بھی آدمی کو نہیں دی ہوگی۔ اس کا باپ ستیش بھی اس لڑکی پر عقیدت رکھتا تھا۔ اسی لئے اس کی سوتیلی ماں کے دل میں درد پیدا ہوتا تھا۔ دبھا آسمانی رنگ کی ساڑھی پہنتی تو وہ کہتی کہ دبھا کو اچھی نہیں لگتی۔ دبھا اپنی بہن سے زیادہ

محبت نہیں کرتی تھی ۔

وبھا قدم قدم پر رکاوٹ پا کر کامل طور پر اپنے باپ پر ہی انحصار کرنے لگ گئی جس سے اس کا جسم لاغر اور کمزور ہو گیا ۔

پہلے تو ماں کی موت ہوئی اس کے بعد وہ اپنے باپ کی خدمت کرتی رہی یہی اس کا واحد مقصد رہ گیا تھا ۔ اس محبت افروز باپ کی تمام امیدوں کو اس نے اپنی خواہش بنا لیا تھا ۔ ستیش اپنی بیٹی کو کچھ جائیداد دے کر آغوشِ مرگ میں پہنچ چکا تھا ۔ مگر ٹرسٹی کے ذریعہ خرچ کے روپے مقررہ طور پر ہر ماہ ہی حاصل ہوتے تھے ۔ اس کے علاوہ ضروری رقم وبھا کے مناسب ور کے ساتھ بیاہ کے لئے جمع تھی ۔ اپنے باپ کی عظمت کے مطابق وبھا مناسب شوہر تلاش کرنا چاہتی تھی ۔ ایک روز ابھیک اس بات کو لے کر کہنے لگا ——— جسے تم اعزاز نہیں دینا چاہتی ایسا تو نہیں بلکہ جس کو ضرور سے اذیت دینے پر تلی ہوئی ہو ۔ اسی کو بہتر خیال کرتی ہو ۔ ہوا میں خنجر گھونپنے سے تم تکلیف کا احساس کرتی ہو ۔ مگر گوشت اور خون سے مترکب دل میں درد نہیں ہوتا "

یہ سن کر وبھا روتی ہوئی چلی گئی ۔ ابھیک نے کہا ——— بھگوان کی عقیدت سے وبیل کام دے سکتی ہے مگر باپ کو لیکر نہیں

دس بجے ہوں گے وبھا کی نوکرانی نے آکر کہا ——— دیدی ! وقت ہو گیا "

وبھا نے اس کے ہاتھ میں چابیوں کا گچھا دیتے ہوئے کہا ——— تم دروازہ کھول دو میں نہیں جا رہی ہوں "

فضول کاموں کی عادت نہ ہونے پر کام بڑھ جاتا ــــ وبھا کی دنیا بھی اسی قسم کی تھی۔ دنیا کے عملیات سبک ہوتے ہوئے بھی بیدل کے بدلے وسیع ہو گئے ہیں۔ اس کے اپنے متقرر عالم کے لئے اپنے ہاتھوں سے اس کی بنائی ہوئی عادت نوکرو غیرہ رکھنے پر کسی کی عادل حکمی رکھتی ہے۔ ابھیک بولا ــــ تمہارے ایسے کرنے سے ناانصافی ہوتی ہے۔ صرف ان کے متعلق ہی نہیں بلکہ اپنے متعلق بھی۔ اسے آزادانہ طور پر غور و فکر کی فرصت کہیں نہیں دیتے ڈومینن سٹیٹس یا آج کل کی ہی طرح۔ اچھا اب تم کو کے کہ میں ایک امتحان کرنا چاہتا ہوں اسی لئے تمہارا امتحان لینا چاہتا ہوں۔ کبھی تمہاری غرض کی بات نہیں کی آج کہہ کر دیکھوں گا یہ نئی ناداری ہو گی۔

وبھا بولی ــــ ایسا ہی سہی۔ ادھار کیوں دکھا جائے

ابھیک نے منی بیگ جیب سے باہر نکال کر دکھا دیا۔ اس میں تھی ایک رسٹ واچ۔ بڑی پلیٹنم کی اور سونے کی زنجیر تھی۔ ہیرے کے نگینے بھی کہیں کہیں جڑے ہوئے تھے وہ کہنے لگے ــــ بیچنا چاہتا ہوں

"تم نے حیران کر ڈالا کیا اسے بیچو گے؟"

"ہاں بیچ دوں گا۔ اس میں حیرت ہی کیا ہے؟"

وبھا تھوڑی دیر تک مبہوت رہ کر بولی ــــ یہ گھڑی کیا تمہاری فال فرجنم دن پروی تھی! معلوم ہوتا ہے۔ اس کے دل کی دھڑکن کا ابھی تک اس میں احساس پایا جاتا ہے۔ جانتے ہو۔ اس نے کتنے دکھ برداشت کئے تھے۔ کتنی تذلیل برداشت کی تھی۔ اور کس قدر کافی خرچ کیا ہوگا۔ تمہیں یہ

تحفہ دینے کیلئے"

ابھیک بولا —— ہاں یہ گھڑی اسی نے دی تھی۔ یہ کبھی معلوم نہیں کر سکوں گا۔ مگر میں کوئی بُت تو ہوں نہیں جو اپنی جیب سے اس بُت کو نکال کر اس شے کو اہمیت دے کر دل میں دن رات سنبھالے گھڑیال بجاتا رہوں"

"تم حد کرتے ہو۔ انہیں محرقہ تب ہوئے کتنے ماہ ہوئے ہوں گے۔"

"وہ تو اب رنج و راحت کا احساس ختم ہو گیا"

"آخری وقت تک اسی یقین سے وہ مری تھی کہ تم انہیں چاہتے تھے"

"غالباً ایسا یقین نہیں کیا تھا"

"تو پھر؟"

پھر کیا۔ یہ نہیں اگر اس کی محبت کا دان آج بھی حاصل ہو تو اس سے کیا اور بہتر ہو سکتا ہے؟"

دبھا کے منہ پر از حد حیرت کے آثار دکھائی دیئے۔ لمحہ بھر خاموشی کے بعد وہ بولی —— اور جگہ پہنچنے کی بجائے اسے میرے پاس کیوں لائے ہو۔

"تم اس کے متعلق کیوں پوچھتی ہو؟ نہ پوچھو"

اس کا مطلب یہ ہوا۔ کہ کلکتہ کے بازار میں بھی اس کو بیچنے کی تیاری کر دل اس کا مطلب یہ کہ خوشی سے چل سکتی ہو۔

ایسے آدمی میں جوش محبت میں ضبط کا یارا نہیں وہ تو صرف زور سے سینہ تان دیتے ہیں کچھ بھی شرم کی وجہ سے جو کچھ بھی ہو وہ نہیں جانتے یہی تو فطری شعور ہے۔ یہی تو مناسب اور غیر مناسب کو پہچاننے کی کسوٹی ہے

اسی لئے تو اسے ماں کی محبت کی کشش ہے مگر اظہار انس کی تاب کہاں؟ اپنے فرض کی شناخت کے بعد جو سنبھل کر چلتا ہے۔ اسے کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی۔ اور جس کو شعور نہیں اسے انصاف اور بے انصافی میں ٹھیک ہی جچتا ہے۔

ڈمسیک کے پلاننگ پیپر پر تھوڑی دیر نیلی پنسل کے نشان بنائے ہوئے وہ مجا بولی" اچھا جب میرے ہاتھ میں رقم ہو گی تو تمہیں دے دونگی مگر اس وقت میں کچھ نہیں دے سکوں گی"!

پُرجوش آواز میں اجیک ــــ خیرات! تمہاری طرح اگر میں دولتمند ہوتا تو تمہارا دیا ہوا عطیہ خیال کر لیتا۔ اور معاوضہ بھی سکوں کی شکل میں دیتا۔ اچھا انسانی فرائض سے میں محروم سہی۔ اس کے بعد میں پھر ایک پیسہ بھی نہیں لوں گا!

وہ بھا بولی ــــ لڑکیوں کو تو یہاں تک ہی زور ہے۔ اے اگر [illegible] ماننی چاہیئے۔ اسی لئے یہ گھڑی نہیں لی۔ اچھا سنو کیا تم اپنے [illegible] اسے [illegible] چاہتے ہو"

تو سنو یہ تو تم جانتے ہو کہ میرے پاس ایک خراب فورڈ موٹر ہے آٹھ سو روپے اور دے کر اس کے بدلہ میں باپ دادا کے عمر کی ایک پرانی کلائی ڈسلر ملنے کی امید ہے۔

یہ کلائی ڈسلر گاڑی سے کیا بنے گا؟
بیاہ کیا جا سکے گا۔
ایسا خراب کام تم کرو گی ممکن نہیں"

"یہی درست ہے اسی کو لیکر پہلے تمہاری کروں گی شیلا کو دوں گی ما اچھے خاندان کی لڑکی ہی ہے نا؟"

"تمہارے ہمراہ ہی کبھی نہ کبھی دیکھوں گا"

"میرے پاس خواب جگہ تیار ہے۔ اور بھی چار پانچ ساتھ لانا جو ترقی پسند ہوں اگر اعلےٰ قسم کی ہو تیں تو بڑی خوشی ہوگی"

"یہی کیا صرف لڑکیوں سے جگر میں چھپیا۔ ٹھیریں گے کیا اس سے کچھ کم خوشی ہوگی میں بھی یہی سوچتی ہوں لیکن تمہارے منہ سے تمتے ہوئے یہ اچھی معلوم نہیں ہوتی ہے اچھا کھلے دل سے کہتا کیا اس لڑکی کی خوشنمائی تمہارے لئے بعید از انصاف نہیں ہے۔ جس کو قدرت کی گلکاری کہا جا سکتا ہے"

خوبصورت لڑکیاں شروع سے ہی قدرت کی خوش آئند توجہ سے ہوا کرتی ہیں

تذلیل کی احتیاج جب ہوگی کر لینا۔ جس طرح ایام مصیبت میں جب غرور کیا گیا تھا۔ توراچندر نے اپنی ماں سے کہا۔ تمہیں اب ماں لکنکر کبھی نہ بلاؤں گا اتنے دنوں تک بلانے سے جو نتیجہ برآمد ہوا ہے نہ بلانے سے اسے دیکھتے ہوئے زیادہ نہیں ہوگا۔ ایسا کرنے پر تذلیل اور تکرار کی نوبت نہیں آئیگی میں بھی تذلیل کی بجائے بھگوان کا سمرن کروں گا

"کس کی تذلیل؟"

میں کہتا ہوں شیلا کو اپنی گاڑی میں سے کرنٹ بال کے میدان سے کھٹ کھٹ کی آواز پیدا کرتے ہوئے پچھلی طرف پیدل چلنے والوں کی ناکوں میں دھواں چھوڑتے ہوئے ہم گئے تھے۔ اتنے میں وہاں کوئی خوبصورت فائرٹ گارڈ کی

سے آیا اور ہاتھ بڑھا کر ہماری گاڑی کو راستہ میں ہی روک کر ارے بھائی ——— ارے بھائی کہنے لگا اور ادھر ادھر بھیڑتے ہوئے گاڑی کے ہڈ اور ورا پر ان کے پائدان پر چڑھ کر چکر لگانے لگا۔ تمہارا بھگوان اگر کیمونسٹ ہوتا تو تم لڑکیوں کی صورت کو اس طرح ٹیڑھا بناتے تو اس قدر دل کو مسحور کرنے والا حادثہ تو نہ ہوتا۔

تم یہی سمجھتے ہو ———

ہاں اسی کو درست خیال کرتا ہوں جتنا جلد ہو سکے گا بس شیلا کو کلائی لسکری گاڑی پر چڑھا کر منہ کے سامنے ہارن بجا کر چلوں گا۔ اچھا ایک بات پوچھتا ہوں سچ بتانا تمہارے جی میں کیا کوئی فکر ہے ———"

مجھ سے اس طرح کیوں دریافت کرتے ہو قدرت نے میری صورت کو لے کر تو کافی سے زیادہ اشتیا نہیں بنائیں اور میری گاڑی بھی تمہاری گاڑی کے ہم پلہ نہیں ہے۔

دلیپ فوراً چونک اٹھا۔ اور رسما کے قدموں کے قریب بیٹھ کر اس کا ہاتھ دیکھتے ہوئے بولا ——— کس سے کس کا مقابلہ! حیرت ہے تم عجیب ہو۔ میں کہتا ہوں تم عجیب ہو۔ تمہیں دیکھ کر مجھے خوف ہوتا نہیں تمہیں خوف ہو۔ تمہیں دیکھ کر مجھے ڈر لگتا ہے۔ کہ کسی دن تمہارے بھگوان میرے خانۂ دل میں جگہ نہ پکڑ لیں ان کے علاوہ میرا بچاؤ نہیں ہوگا۔ تمہارے حسد میں کسی بھی طرح نہیں جان سکا اخیر تک نہیں سمجھ پایا۔ اس لئے تم ہی جانو ———

خاموش رہو میں کچھ نہیں جانتی صرف یہی جانتی ہوں کہ تم عجیب ہو۔

اور خالق دو جہاں کا تیار کردہ مجوبہ ہو"

ابھیک بولا ـــــ تم میرے سامنے کمل کر نہ بولو میں یقینی طور پر دریافت کرتا ہوں۔ کہ کیا شیلا کے متعلق تم میری سائیکالوجی جاننے چاہتے ہو اس سے ہماری کافی عادت ہو جائیگی۔ کمسنی میں جس طرح سگریٹ پینے کی عادت پڑ گئی ہے۔ جس کو اب چھوڑ نہیں سکتا۔ جتنی کوشش کرتا ہوں جی نہیں مانتا یہ جان کر کیا کروں دن بدن موت سر پر آ رہی ہے۔ لڑکیوں کی محبت میں تو نشہ ہے اس سے میرا "انسپریشن" ہے میں مسرور ہوں اور جو میرے مناسب ہوا نہ ہو گی تو میں لٹھیرا رہوں گا پوچھتی ہو میرے قریب بیٹھ کر شیلا کے دل میں ایک آگ جلتی ہے۔ ڈسنپرز سگنل اس کی تجلی میرے جسم میں موجزن ہوتی ہے الزام نہ عاید کرنا مجوبہ یہ عیاشی میری پسندیدہ ہے ... نہیں نہیں اس سے میرا کوئی مطلب نہیں ہے

" تو کیا تمہارا مطلب کلائی سلر گاڑی سے ہے

یہ قبول کروں گا شیلا میں جب غرور جوش پر ہوتا ہے تو اس کی کشش زیادہ موثر ہو جاتی ہے لڑکیوں کے لئے اتنے زیور اور کپڑے اسلئے اکھٹے کئے جاتے ہیں۔ نہیں کہ ہم چاہتے ہیں لڑکیوں کی لذت اس کی کشش کا باعث ہوتی ہے قدرت کا یہ تانا بانا مرد اعلےٰ معیار پر کھتا ہے بتاؤ کیا یہ درست نہیں ہے۔

درست ہو سکتا ہے لیکن دولت کسے کہتے ہیں اسکی بنا پر تو دلیل بازی ہوتی ہے کلائی سلر کی گاڑی کو اگر دولت کہا جائے تو میں کہوں گی کہ مردوں کو حقیر بنانے کیلئے ہے۔

پُرجوش ہو کر غضب سے ابھیک بولا ـــــ سمجھ گیا تم جسے دولت کہتی ہو اس

اس کے بلند پایہ تم ہمیں پہنچا سکتی ہو تمہارے [illegible]

ابھیک کا ہاتھ چھوڑ کر وبھا بولی ـــــ یہی بات بار بار سنکر میں تو بیزار ہوگئی
ہی سنتی ہوں۔ بیاہ تو آرٹسٹ کیلئے گلے میں پھندا ہے انسپریشن کا پھندا ہے اگر میں
تمہیں بڑا کر سکتی اگر میرے اندر اس قدر قوت ہوتی تو ـــــ

ابھیک جھنجلا کر بولا ـــــ تم کیا کر سکتی میرے اس دکھ میں جو راز ہے
کیا تم اسے پہچان سکتی ہو؟ اگر شناخت کر سکتی ہے تو اپنے دھرم کرم کے سب
بندھن چھوڑ کر میری ہمرکاب ہو کر کھڑی ہو جاؤ۔ میں اس میں کوئی اڑچن نہیں
جانتی۔ کشتی ساحل مراد پر آ پہنچی ہے۔ لیکن لنگر کے باوجود اٹھ کر مسافر اترنا نہیں
چاہتے۔ میری بھی بالکل یہی حالت ہے۔ محبوبہ! میری دلبر!! تم کب کامل طور پر
میرا ارتقا کر پاؤ گی؟

”جب مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہوگی“

”یہ تو فضول بات ہے اس طرح کی جھوٹی باتیں تو تم کئی بار کہہ چکی ہو تو مجھے
قبول کرو۔ میں اس معاملے میں جاننے کا خواہشمند ہوں کیا یہ مجھ سے درپردہ رکھو گی“

اس کے بعد باقی اور کیا رہ جاتا ہے۔ چھپایا کیوں جائے جو سچ میں ہو کہتی
ہوں۔ فضول بات نہیں کرنا چاہتی۔

میں تمہیں چاہتا ہوں۔ غریب ہوں دن رات یہی کہتا ہوں میں چاہتا ہوں
میں چاہتا ہوں میں تمہیں چاہتا ہوں اور اس کے ساتھ کلائی گسلمہ کی گاڑی بھی“

”یہ تو پہاڑ کا لاوا چل رہا ہے ـــــ درمیان میں گھنا دھواں بھی بلند ہوتا
ہے۔ کیا یہ محبت کی دبی ہوئی آگ ہے کیا یہ بجھے گی یا نہیں بالکل نئی بات ہے“

ابیک ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو کر بولنے ہرے "

" یہ کیا غلطی کر رہے ہو اس لیے تم دریافت کر رہے تھے ۔ کیا تم اسی طرح آگے بڑھ دو گے !؟

ہاں ہاں اسی لیے ، یہ بات مانتی ہو میں اس گھڑی کو مناسب رقم پر اسی وقت فروخت کرنا چاہتا ہوں ۔ مگر تمہارے پاس میں صرف رقم مانگنے نہیں آیا جس جگہ تمہیں تکلیف سے وہاں زخم کو درست کرنا چاہتا ہوں مگر بد قسمت کے مقدر میں یہ بھی نہیں ہو گا ــــ یہ بھی نہیں ہو گا

تم نے یہ کیسے جانا ؟ ہر وقت تو قسمت ساتھ نہیں دیتی مگر دیکھو ایک بات کہتی ہوں ــــ تم اس کا اثنا میں دریافت کر رہے ہو ۔ تمہارا یہ کھلواڑ ہی دیکھ کر مجھے اچھا معلوم ہو گا ۔ سچ بتاؤ ۔ اچھلے گا "؟

ابیک جوش سے بولا ــــ یہ تو اچھی خبر ہے ۔

دبھا نے کہا ــــ زیادہ خوش نہ ہوجیے ، یہ بہتر نہیں ۔ یہ عیب بڑتی ہے لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے تمہارا یہ سلوک غیر مناسب ہے یہ غیر مہذب جھجک اس سے تو تمہاری عورت ذات سے نفرت کا اظہار ہوتا ہے ۔ یہ مجھے اچھا نہیں لگتا ۔

یہ کیسے ! کیا عقیدت کی انفرادی خصوصیت نہیں ؟ جہاں بھی جا کر دیکھو گی محبت آہستہ آہستہ بڑھتی ہے ۔ مال کی پرکھ کی نہیں ۔ بلکہ بیک قلم ٹھوک مجرو ! اسے کہتے ہیں ۔ حفاظت خود اختیاری ۔ بیوپار کے اصولوں کے برعکس نامناسب فضول بڑھا کر دام کا بڑھانا

" فضول دلیل بازی نہ کرو "

یعنی تم دلیل داروں میں نہیں۔ اسے ہی کہتے ہیں خوفناک ایام۔ لڑکیاں باتیں کریں اور مرد لاجواب ہو جائیں

ابھیک! تم تو بات سے بات کی سوچتے ہو۔ سچ جانو میں کہنا چاہتی ہوں کہ لڑکیاں فطری طور پر ہی باریک بینی سے کام کرتی ہیں۔ جو ان کا مرد کے متعلق اخلاقی فرض ہوتا ہے۔

فطری طور پر ہی باریک بین ہوتی ہے یا غیر فطری؟ ہیں میں عہد حاضرہ کی تربیت کو فطری نہیں مانتا۔ شیلا کو پاس بٹھا کر گاڑی چلانے سے باہم فطری محبت لازمی ہے اخلاق کو مدنظر رکھ کر ڈیڑھ ہاتھ جگہ خالی رکھنی پڑتی ہے

ابھیک! معلوم ہوتا ہے۔ تم لڑکیوں کی قسمت رقم سے پانا چاہتے ہو۔ اسی لئے رزق کے بندے بنے ہوئے کمیں کھیلتے ہو۔ وہی رقم آج اگر واپس مل جائے تو مسرت کو ارزاں کر دے اور اپنے طالب کو خالی چھوڑ دے مگر یہ جھوٹ بولتے ہو کر ماڈرن کلچر کا یہ اثر ہے

ابھیک نے جواب دیا۔ اسے اثر نہ کہو بلکہ کہو بے حیائی اس وقت کا بوڑھا سو آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ مگر آج کل کا بندی آئینہ ہاتھ میں لئے اپنی صورت دیکھتے ہوئے تحمل کرتا ہے۔ جس کو کہتے ہیں Learning .c

آج کل ایسے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی ہم بھولے ناتھ کے چیلے بن کر پیشانی پر رنگا تلک لگائے بغیر اس کا کام ہی نہیں چل سکتا تندی کی شکل و صورت کا بھروپ بھرنے میں ہی بھلا کمایا جا سکتا ہے

اچھا اچھا جاؤ، نام پیدا کرکے ہر سمت کو پلٹ دو مگر مجھے یہ سچ بتاؤ کہ

کہ تم پر امید بانتے جو لڑکیاں ذلیل بازی کرتی ہیں کیا تمہیں یہ اچھا لگ سکتا ہے۔ تم بات بات میں جس کو [illegible] کہتے ہیں کیا تم نے اسے دیکھی کبھی پڑھا ذرا کبھی نہیں ڈالا۔

میں نے ٹھیک کہا تھا اسے [illegible] کہتے ہیں اور جس [illegible] وہ ہوئی خوش بختی سے اول نمبر کی شے مگر جب تم پارٹی کا بحث مباحثہ کہتی ہو وہ ہوگا سیکنڈ ہینڈ دوکان کا حال وہ خراب اور داغدار ہوگا لیکن بازار میں تو فروخت ہی ہوگی خواہ کم قیمت میں ہی ان اشیا کی پوری قیمت دینے والے کتنے دولت مند ہوں گے

ابھیک تم دے سکتے ہو۔ یقیناً دے سکتے ہو تمہارے ہاتھ میں پوری رقم ہے مگر تمہاری فطرت عجیب ہے تھوڑے دور گنڈال کو چھوڑ دو۔ اس خیال کو تمہارے جیسے مصور کے لئے ایک کھیل ہے کھیل ہے تمام استاد تمہارے پاس [illegible] نہیں ہے یہ تو فضول سی دلیل ہے"

یہ سن کر وہ بجا کرسی سے اٹھ کر اندر کمرہ میں چلی گئی پھر واپس آ کر وہ ابھیک کے ہاتھ میں ایک نوٹ دے کر بولی ——— یہ تمہارا انسپریشن نہیں ہے یہ کمپنی کا ساورکا مارکہ ہے مگر اسے دیکھ کر آپ گھڑی دینے کے متعلق میرے ساتھ بات چیت نہ کرنا"

کرسی سے اٹھ کر ابھیک میز پر بیٹھ گیا وبھانے عجلت سے اس کا ہاتھ دبا کر کہا ——— اسے میری غلطی نہ کہو تمہاری غیر موجودگی کی کمی ہے یہ میری کمی کیلئے ایک خوش بختی ہے۔

دبھا کا ہاتھ الگ ہٹا کر ابھیک بولا ——— یہی ہے میری ———
اور سخت ترکمی - خوش قسمتی تو تمہارے ! ہاتھوں میں رہتی ہے اسکی تکمیل رپو کل سے نہیں ہو سکتی۔

دبھا ابھیک کے ہاتھ پر محبت سے ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی: "جو ہو چکا مجھے اس کا ہمیشہ دکھ رہے گا۔ اب اس سے جس قدر راحت مل سکتی ہے ہم اس سے کس لئے بے بہرہ رہیں

نہیں! نہیں کبھی بھی نہیں۔ تمہاری مدد لیکر ہی میں شیلا کو بھی گاڑی پر بٹھاؤں گا۔ اس تجویز کو باعث انکار خیال کرنا ہی مناسب ہے یہ امید تھی کہ محبت کروں گا؟"

محبت کرو گے؟ تمہاری برائی ہوئی ہے کتنے وقت کی ہے یہ تو شیلا کیلئے خوفناک ہے تمہارے حق میں نہیں ہے کئی لڑکے تو کتنی بار تمہیں دیکھ دیکھ دل ہی دل میں مسکرا چکے ہیں معلوم ہوتا ہے کچھ دنوں کے بعد تمہارا یہ کھیل چلنے کا نہیں ہے یہ بھی جانتا کہ وہ دائمی نہیں ہو گا اگر تمہیں کچھ شک ہے تو نہیں

محبوبہ! اگر تم مجھے اچھی طرح پہچان جاؤ گی تو بالکل بے فکر ہو جاؤ گی تم جانتی ہی ہو کہ مجھے لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔ لیکن یہ تو ایک قسم کا الحاد ہی ہے۔ اس سے کوئی بندھن معلوم نہیں ہوتا پتھر کے مندر میں لاکر پوجا کیلئے وہ مجبور نہیں کرتا۔ سہیلیوں کے آپس کے تخیل اور حیرت ناک نتائج کئی بار دیکھے ہیں مگر لڑکیاں میرے سامنے مجھے ملحد اور مصور کی طرح ہی جانتی ہیں میں بھولا نہیں ہوں۔ جو لڑکی مجھ سے حسد کرتی ہے وہ تو بھی ہے تم بھی لالچی نہیں۔

ہو تمہارے بے کیف دل کا شناسندہ دان آزادی ہی ہے ؟

وہ مسکرا کر کہنے لگی ۔ تم ابھی اپنی تعریف رہنے دو ۔ مصور تمہارا چالاک بچہ اس بار جو تماشہ کر رہا ہے ۔ وہ اب نہیں کرے گا ۔ میرے ہاتھ میں ہے ۔

ہیں، ہیں اچھا ایک بات تو بتاؤ ۔ تم نے اپنے ٹرسٹیوں سے یہ رقم کس طرح حاصل کر لی !

اگر ساری کیفیت بتا دوں گا تو تمہیں خوشی نہیں ہو گی تم جانتے ہی ہو کہ امر بابو سے میں اقتصادیات سیکھتی ہوں ؟

" اچھا اس لئے تم مجھے بہت دور گھسیٹ لے جانا چاہتی ہو اور علم سے بھی "

" خاموش رہو ۔ سنو تمہارے ٹرسٹیوں میں ایک شخص ہیں آدھیتہ ! وہ خود اقتصادیات میں اول نمبر کے انعام یافتہ ہیں ۔ ان کا یقین ہے کہ مناسب موقع پا کر امر بابو دوسرے راما نج بنیں گے انہوں نے ایک پرابلم آئن سٹائین کے پاس روانہ کی تھی ۔ ان کا جو جواب زیادہ میں نے دیکھا تھا ایسے لوگوں کی امداد سے ان کی بھلائی کی قدر ہوتی ہے ۔ میں نے یہی کہا کہ ان سے اقتصادیات سیکھوں گی آدتیہ خوب خوش ہوئے اور تعلیم کی مد سے ٹرسٹ فنڈ سے کچھ رقم نکال کر میرے ہاتھ پر رکھدی اس میں سے ان کو وظیفہ دیتی ہوں ۔

امبیک کا رنگ نا معلوم کیسے ہو گیا کچھ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بولے ایسے آرٹسٹ بھی ہیں جو مناسب موقع پا کر دقت ہاتھ سے نہیں جانے دیتے کوئی بہتر موقع نہ پا کر بھی تو کامیاب ہو سکے گا بتاؤ مجھ سے ٹکٹ

خرید و گے یا نہیں "

"کونسا کھیل ہے"؟

"ہم تو کافی عرصہ سے تمہارے لئے کھیل دیکھنے کی رقم دیتے رہے ہیں اس میں ہرج ہی کیا ہے"!

آج اسی جگہ کالا کالر کی راحت افروز یاد ہو گی ترقی پسندوں کی ترقی نہایت تیزی سے فورڈ موٹر کی مانند چلی جا رہی ہے۔ اب یہ باتیں اچھی معلوم نہیں ہوتیں ۔ سنا ہے امر بابو ولایت جانے کیلئے جو رقم اکٹھی کر رہے ہیں وہاں سے ڈگری لے کر آنے کے بعد وہ کوئی معمولی آدمی نہیں رہیں گے۔

دبھا بولی ـــــ "میں امید کرتی ہوں۔ کہ ایسا ہی ہو جس سے ہمارے ملک کی عظمت بلند ہو"

بلند آہنگی سے ابھیاک بولا ـــــ "میں یہی ثبوت عیاں کروں گا خواہ تم امید رکھو یا نہ رکھو، اس کا ثبوت آسان ہے راجک کے مقررہ راستہ میں ـــــ آرٹ کی بھی دل پسند لائن ہے۔ جو کہ میکیف لوگوں کا پرائیویٹ راستہ ہے وہ گرانڈ ٹرنک روڈ نہیں ہے میں ان آنکھوں سے تاریک تر ملک دیکھنے کا متمنی نہیں ہوں۔ جس دن آزادانہ دیکھنے کی مرضی ہو گی میں اس وقت ولایت جاؤں گا ایک دن میں نے آدتیہ سے کہا تھا کہ میں بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں اور ان کی بھیڑ سے بھی"

"بحث کی بات نہ ہو تم ملیک ابھیل کا ثبوت جاننے کیلئے صبر نہیں کر سکتے ہو تم اس کے پاس ولایت جانا چاہتے ہو"

"تو میرے رات دن کا خواب ہے"

ایسا ہی نہ ہو جیسی میری خواہش ہے۔ عظمت کو پا کر میرا مقصد ہی شاہی محصول ہے"

اب یہ بات بند کرو سوالوں کو اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ اقتصادیات کے پروفیسر کی خواہش تکمیل پذیر ہو جائے میرے لئے یہ زمانہ نہیں ہے دوسرا زمانہ ہے۔ ضرورت پڑنے پڑنے پر کشش مکشش ہی رہتی ہے میں نے یہی کہہ دیا ہے۔ کہ وہ ایک دن آئے گا جس دن آدھی رات کو تمہیں تمہارا نام سنائی دیگا۔ نام کے ساتھ دوسرا نام چسپاں ہوگا۔ زمانہ سابق کی ہی طرح مگر یہ ہوگا نہیں

پیسٹ منٹی کے لئے تم اپنی خواہش نہیں کر سکتے ابیک! میری سخت سزا شروع ہو چکی ہے

"تم کس سزا کی بات کہتی ہو جسے میں نہیں جانتا۔ مگر جانتا ہوں دیکھتے ہوئے تم مجھ سے دریافت نہیں کر سکتیں مگر سب سے بڑی سزا ہے میری تصویر نیا زمانہ آیا ہے ان۔ مانہ کی مجلس میں تمہیں دیکھ کر میں نے کچھ نہیں پایا۔

—— کہتے ہوئے ابیک دروازہ کی طرف چلنے لگا۔

دیدیا نے کہا "کہاں جاتے کہاں ہو"

"میٹنگ میں"

"کیسی میٹنگ"

"چھٹی کے وقت طالب علموں کو لے کر درگا پوجا کریں گے"

"تم پوجا کرو گے"

ہاں، میں بھی کروں گا۔ میں پہلے یہ نہیں جانتا تھا۔ میرے اس زمانہ میں تینتیس کروڑ دیوتا اور چھوٹے دیوتاؤں کی جگہ کی جو کھینچا تانی رہی۔ وہ اب نہیں ہوگی۔ ساری کائنات کے بچوں کے لئے آسمان بے رونق ہو گیا ہے"

دیبھا نے سوچا۔ دیبھا کے بھگوان کے خلاف فلسفی مخول ہے اس نے کوئی دلیل نہیں دی اور وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

الیپک دروازہ کے قریب آکر بولا ——— دیکھو جی! تم کٹر قوم پرست ہو۔ ہندوستان کے اتحاد کا خواب دیکھو۔ مگر جس ملک میں دن رات مذہب کے نام پر کشت و خون ہوتا ہے اس ملک میں تمام مذاہب کے اتحاد کا نیک کام میرے خیال میں ملحدوں کا ہی کام ہے باقی سارے ہندوستان کے نفاق کا ہی باعث ہیں۔

الیپک کا اتحاد نا معلوم کیوں خوفناک ہوا تھا۔ دیبھا یہ جانتی ہے اسی لئے وہ اس محبت نہیں کرتی کوئی فیصلہ نہیں ہو پاتا۔ کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

دیبھا کے پاس جو کچھ بھی تھا۔ وہ اسے دے چکی تھی۔ اس کی خواہش کسی فرقہ سے مخصوص نہیں تھی۔ اور نہ ہی فضول دلیل کا موضوع تھا۔ وہ اس کی عادت کا حصہ تھا۔ اس کی تذلیل نہیں ہو سکتی۔ بار بار دل میں خیال اٹھتا تھا اس اڑچن کو کیسے پاٹا جائے مگر آخری وقت تک اس کا کسی بھی طرح حل ہوتا معلوم نہ دیا۔

بیرہ نے آکر خبر دی ——— امر بابو آئے ہیں" ابھیک فی الفور تیزی سے سیڑھی سے اتر کر باہر چلا گیا۔ اس کا دل سہم گیا پہلے اس نے سوچا کہ ماسٹروں کو خبر دوں۔ کہ آج سبق یاد نہیں ہو سکا لیکن یک لمحہ دل کو قابو میں لے کر اس نے کہا ——" اچھا یہاں ہی لے آؤ" بیٹھتے ہوئے کہا — ایک جھگڑا اور آگیا ہے

خواب گاہ میں بستر بچھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اپنے آپ کو سنبھال کر ہاتھ منہ دھو دیا اور مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی ——" آج جی چاہتا ہے کہ کچھ نہ کھاؤں"

کیا طبیعت اچھی معلوم نہیں ہوئی؟"

" نہیں بات یہ ہے کہ کتنے ہی دنوں سے اتوار کی چھٹی کوشش سے مل نہ سکی رہ رہ کر اس کے لئے غصہ آنے لگا۔

ماسٹر نے کہا ——" مجھے بھی ایک چھٹی کرنے کا خیال نہیں آیا۔ میں بھی اب چھٹی لوں گا۔ وجہ تو معلوم ہی ہے اس سال کوپن ہیگن میں عالمگیر اقتصادی مجلس ہوگی۔ میرا نام کسی طرح وہاں نظر پڑ گیا۔ اس کا پتہ نہیں کہ ہندوستان سے صرف میں ہی مدعو کیا گیا ہوں اتنا موقع کبھی رائیگاں نہیں جانے دوں گا"

" ابھا حوصلہ مندی سے بولی —— بیشک آپ کو ضرور جانا چاہیئے۔

ماسٹر نے مسکراتے ہوئے کہا —— تمہارے انسپکٹر مجھے جب مجھے ڈیپوٹیشن میں بھیج سکیں تب ہی تو، بعد کو میرا دماغ محنتی ہو جائے گا۔

اس لئے ان کی خواہش میرے بھلے کے لئے یہی ہے وہاں پر اگر کوئی بھی معاون ہو زیادہ چالاک نہیں ہوگا اس کی تلاش کروں گا۔ لیکن ہم فلسفی ہیں کسی پر انحصار سے قبل ہم زندہ ثبوت کی تلاش کرتے ہیں

دبھا پُرجوش ہو اٹھی اور بولی —— جہاں تک انسان ہوگا وہ کسی دوسرے سے عناد کریگا ہی وہ دیوتا تو ہے نہیں

دو چار باتوں کا معاملہ تو ہے نہیں۔ اس دن کی طرح کہیں تماشہ بن جائے۔

امر بابو منجھلے قد کے تھے سانولا رنگ۔ تندرست جسم، چوڑی پیشانی، سر کے دونوں طرف بال اڑے ہوئے تھے۔ منہ پر خوشنمائی جسے دیکھ کر دل خوش ہوتا تھا کسی سے بھی عناد کی فرصت سے عاری۔

آنکھوں میں حیرت و استعجاب نہیں تھا۔ ہر ایک سے رفاقت سے پیش آتے تھے۔ لیکن ان کے دوست تھے۔ بھی قلیل وہ ان سے بڑی امیدیں رکھتے تھے۔ اور باقی جو انہیں جانتے تھے۔ وہ ناک سکوڑتے تھے۔ انہیں کہا جاتا ہائی براؤ۔ کم گوئی کی وجہ سے لوگ سمجھتے۔ کہ مردہ دل ہیں۔ ان کی منزل حیات کے متعلق لوگوں کو بہت کم علم تھا۔ ان کی سائیکالوجی کے متعلق مزہ کی بات یہی تھی کہ دس آدمیوں کو بھی علم نہیں تھا۔ کہ وہ کس طرح رہتے ہیں

آج وہ جانے جو آٹھ سو روپیہ ابھیک کو فی الفور آکر لا دیئے۔ وہ ان کا اندھا جوش ثابت ہوا۔ دبھا کے متعلق ان کے ماموں آدتیہ کو کامل

یقین تھا۔ وہ ہمیشہ اس پر نظر رکھتا تھا۔ لیکن لڑکی کی زندگی میں نامعلوم کب زبردست ہچکولے سے تبدیلی نمودار ہو جائے۔ کسی طرف عیاش لوگ امارت کے ہوتے ہوئے بھی اس کا خیال نہیں کر سکتے۔ اس اچانک ناکامی کا سارا نتیجہ اور شرم دل میں واضح طور پر دیکھ کر ایک لمحاتی جوش دبھانے ابھیک کے متعلق ظاہر کیا۔ محبت کی ایسی دلگداز لہر اس کے دل سے پہلے کبھی نہیں اٹھی تھی۔ اپنے حقوق کا نامناسب استعمال کر کے کسی کو ایک روپیہ بھی دینے کی بات اس نے حوصلہ کرنے کے باوجود نہیں سوچی تھی۔

دبھا کے ساتھ جتنے بھی طالب تھے۔ وہ ان کی مدد کیا کرتی تھی۔ آج اتوار تھا۔ کھانا کھانے کے بعد کافی دیر تک اس کی جماعت بیٹھی رہی سب نے چھٹی منائی۔

زیورات کا بکس نکال کر دبھانے میز پر ایک کپڑا بچھا کر انہیں رکھا اور ایک ایک زیور نکال کر زینت افروز کیا۔ پھر اپنے خاندان کے جانکاہ جوہری کو بلایا

اتنے میں سیڑھیوں سے ابھیک کے پاؤں کی آہٹ آنے لگی دبھانے پہلے تو زیور ادھر ادھر چھپانے کی عجلت سے کوشش کی اور جہاں جہاں بھی جگہ دیکھی وہاں وہاں رکھ دیئے۔ وہ ابھیک کے سامنے کچھ چھپائے، ایسا اس کی فطرت کے خلاف تھا۔

المس   ابیک مکان میں داخل ہو کر دیر تک کھڑا کھڑا دیکھتا رہا۔ سوچا بات کیا ہے بولا ـــــ تم نرالی معلوم ہوتی ہو بہت خیالی ہو۔ تم غریب ہو تم یہ بھول جاؤ کہ کسی دوسرے میدان کی شہسوار ہو۔ جانتی ہو!

"نہیں جانتی"

پھر کیا جانتی ہو"

حقیر لوگوں کی عقیدت میں بڑے لوگوں کا غاصبانہ حق میں تو یہی جانتی ہوں"

سمجھ گیا۔ مگر لڑکیوں کے زیور تو انہیں ہی راحت کام کرنے کیلئے ہیں۔ ہم کتنے ہی معمولی ہوں لیکن کبھی ولایت جانے کے لئے نہیں خواہ کتنے ہی بڑا بننے کی امید ہو میری طرح مردوں کی نظر کو تم پہلے ہی متحرک رکھتی ہو۔ اس ہار کو وہ پٹہ کے ساتھ میں نے کسی دن تمہارے گلے میں دیکھا تھا۔ اس وقت ہماری کم جانکاری تھی۔ اس پہلی ملاقات کی یاد سے یہ ہار بھی چھپ گیا تھا۔ یہ ہار کیا صرف تمہارا ہی ہے میرا بھی تو اس میں حصہ ہو سکتا ہے؟

اچھا یہ ہار تمہارے لئے تو نہیں ہو سکتا۔

ٹھیک تمہارے حق سے ہار چھیننا بالکل فضول ہے کیونکہ یہ چوری کہلائیگی تمہارے ساتھ رہنا درست نہیں ہوگا۔ اسی امید میں بیٹھا ہوں جس سے یہ ہار کہیں ادھر ادھر نہ ہو جائے۔ یہی سوچتا ہوں۔

یہ زیور میری ماں میرے بیاہ کیلئے دے گئی تھی جو بھی ہو لیکن آپ کسی نیک و بد ساعت میں اس لڑکی کی زینت افروز تصویر کی امید نہ رکھیں

"کیا دوسری جگہ رشتہ طے پایا ہے"

"ہو گیا ہے دیترنی کے کنارے مگر ایک کام ہو سکتا ہے تم جس سے بیاہ کرو گے اس دلہن کے لئے میرا یہ زیور رکھا رہے گا"

"دیترنی کے کنارے میری دلہن . . .

"یہ نہ کہو تم مجھے اپنی مستحق خیال کرتے ہو ــــــ مجھ نااہل کو"

"جھوٹ نہ بولو - یہ اشارہ سمجھنا ممکن نہیں ہے

"ہو سکتا ہے "

"یہی جس کو کہتے ہیں لڑکپن تاہم یہ امید ہے - کہ اس پر دلیل بازی ہی فضول ہے ایک روز جب سرخ کپڑے پہنے مجھے اچانک دیکھا جائے گا غیر کی دولت . . .

اب زیادہ نہ ڈراؤ تو میں بھی اچانک کچھ کروں گی دوسرے کے ساتھ رفاقت کم نہیں ہو گی "

چھی چھی! یہ بات تو تمہارے منہ سے زیب نہیں دیتی اگر تمہیں دیوی خیال کر کے عقیدت بجالاتے ہیں - کیوں نہ پھر وہ اس کے لئے حادثہ بپا ہو گا - آدمی کو غلطی سے بھی کوئی دیوتا خیال نہیں کرتا - کیوں نہ دیتی کے پیچھے عقلمند کی مانند دیتی کی تکمیل کے لئے حاضر رہا جائے - مشکل تو یہ ہے! میری یہی تجربہ ہے - کہ امر بابو کے دائمی زندہ رہنے کا بار مجھ پر ہی نہ رکھو کیا میں نے اس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا - زیور چھننے کی آدمی کو شرم کیوں دلاتی ہو؟

"یہ نہ کہو، آدمیوں کی عظمت ہی لڑکیوں کے لئے سب سے بڑی دولت ہے۔ جس ملک میں تمہارے جیسے ہوں۔ اس ملک میں ہم خوش بخت ہیں"

یہ ملک ویسا ہی ہے اس بات کو میں پورے طور پر پسند کروں گا امر بابو کی کامیابی سے جو لوگ حسد کرتے ہیں ایسے بنگال میں کافی ہیں۔ اس ملک کے آدمی بڑے لوگوں کی مانند ہیں مگر تمہاری دہائی ہے مجھے اس لنگوری فوج سے خیال مت کرو۔ سنو میں نے کتنا بڑا مجرمانہ کام کیا ہے —— اگر پوجا کے چندہ کے روپے میرے ہاتھ میں تھے وہ دے دیئے میں نے امر بابو کی مراجعت ولایت کے فنڈ میں دے دیئے۔ مگر بتلایا کسی کو نہیں جب پھنس جاؤں گا۔ تو روح حیات کی تلاش کے لئے ماتا کے بھگتوں کے بازار میں چکر ہنیں لگا دے گا۔ میں ملحد ہوں یہیں دریافت کروں گا۔ بتاؤ سچی ریاست کسے کہتے ہیں۔ مگر وہ مرتاضی کیا جانے"

یہ کیا کرتے ہو، ہیک! تم جسے اپنا پاکیزہ ملحد دین کہتے ہو کیا تمہارے لئے مناسب ہے یہ تو واقعی فریب رائی ہے"

"مانتا ہوں مگر میرے دھرم کی بنیاد کسی کو کمزور تو نہیں کرتی۔ خوب دھوم دھام سے دیوتا کہہ کر پرستش کرو۔ مگر چندہ کے روپوں کی جتنی مضحکہ خیز بات ہے اسی قدر افسوسناک بھی ہوسکتی ہے۔ اس سے راحت افروز ناٹک تیار نہیں ہوگا مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ کسی دن شام کے وقت جو مجھے نہ جانتا ہو اسے آدمی کو سادھو کے بھروپ میں پانچ سات چیلوں کے ہمراہ کسی دولتمند بوڑھی بیوہ کے پاس بھیجوں گا وہ کہیں گے کہ اس کا جو لڑکا رنگون میں ہے

اس کو دیوی خواب میں آئی ہے ۔ کہ باقاعدہ پوجا نہ کرنے کی وجہ سے ماں اس
اس کو آکر کھا جائے گی ۔ اس پر وہ مرد گھبرا کر اس بد ساعت کو ٹالنے کیلئے
بارہ ہزار روپیہ مانگیں گا جس دن کامیاب ہو گی اس دن بدیوں سے ہی تعلیم
پائے گا اس سے ہمارا نقصان تو ہونے کا نہیں ہے یہ تمہیں ذاتی طور پر کہتا ہے ۔
قبول کرو ۔ سے اس کا داغ دھل جائیگا ۔

نوکرانی نے آکر کہا ۔ ہیرہ کو بخار آگیا ہے ۔ اور کھانسی بھی ہے ڈاکٹر صاحب
کیا کہہ گئے ہیں !

وبھا کا ہاتھ دبائے ہوئے ابھیک بولا —— دنیا کا ہمدرد وہ بچاری
کے علاج کی تدبیر کرتے تمہارا دن رات الجھا ہوا ہے ۔ اور میں ایک ہرن جیسی بد قسمت
کی صحت بھی ——

کافی خراب ہے ۔ اور تندرست ہونے کے لئے بھی وقعت اور ذرائع
نہیں ہیں

دنیا کی ہمدردی نہیں ہے ۔ کوئی ایک آدمی بیمار ہو تو کیا وہ بد قسمت
بھول جان کیلئے ہی ہے ،

اب رہنے دو میں جاتا ہوں اب تم بیٹھ میرا دیور سنبھال کر رکھ دو ۔
اور میرے لالچ کو کون اپنائیگا ،،

تمہارا دھرم ۔

کچھ عرصہ سے ایبیک کو دیکھنا نہیں گیا اس کا کوئی خط بھی نہیں آیا۔ دھیما اداس ہے۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ فکر بڑھ رہی ہے کیا ہو گیا۔ کیا ہوتا جا رہا ہے۔ کوئی پتہ نہیں چلتا۔ دن آتے اور گزرتے اس کے جی میں صرف ایبیک ہی بسا ہوا ہے۔ جو ضرور طور پر اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ اسے کوئی اڑچن نہیں تھی۔ کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ نا معلوم پھر واپس آئے گا یا نہیں! اس کا مسحور دل کہنے لگا۔ کہ بے شک محبت نہ کرو۔ مگر واپس آجاؤ میں اب تمہیں کوئی تکلیف نہیں دوں گی ایبیک کے تمام ہمراہی اور ان کی جسقدر گفتگو اسے یاد آتی تھی۔ آنکھوں میں آنسو امڈ آتے اور اپنے آپ کو پھر خیال کر کے مطعون کرتی۔

ان حالات میں جھاڑی ڈاک سے ایک خط آیا۔

ایبیک نے لکھا "جہاز ڈیک سے ولایت روانہ ہو گیا ہے تم نے کہا تھا۔ کہ فکر مت کرنا مگر مجھے فکر کرنا پڑتا ہے۔ شاید تم خیال کرو کہ محبت کا ہی یہ روپ ہے میں اس قدر دوری کے باوجود تمہیں قریب خیال کرتا ہوں وجہ یہ ہے۔ کہ میں آرٹ کا شناسندہ ہوں۔ مگر اس تجارت سے آپ کو ذرا بھی عقیدت نہیں ہے۔ یہ میرے پرانے دکھ کی بات ہے مگر میں اس لئے تمہیں مطعون نہیں کروں گا۔ میں کامل طور پر جانتا ہوں کہ ایک دن میرے لذت افروز ملک کے لوگ میرے گرویدہ ہو جائیں گے جن کی عقیدت کی قیمت مستند ہو گی

کافی بے وقوف لوگ میرے تیار کردہ فولڈ کی فضول تعریف کرتے ہیں

اور کئی فضول حسد کرتے ہیں تم مجھے بھولنے کے لئے کبھی بھی بناوٹی ہمدردی نہ کرنا تم جانتی ہو۔ کہ تمہارے ذریعہ میری تعریف میرے لئے آب حیات کی مانند ہے ۔ اگرچہ تمہاری تصویر کے لئے میں نے لا اندازہ دکھ پائے ہیں پھر بھی میں نے اس حقانیت کے لئے ایک بڑی قیمت ادا کی ہے ۔ جب میں دنیا میں نہ رہوں گا ۔ اس عزت افزائی میں ولی انہیں بھی ملا ہو گا ۔ شائد اس وقت تم میری ضرورت محسوس کرو گی ۔ یہی خیال لے کر آج میں کٹھن منزل پر چل پڑا ہوں ۔

مجھے یہ معلوم ہوا ہے ۔ کہ تمہارا ہار چرایا گیا ۔ اگر اسے فروخت کرتی تو میں یہ برداشت نہ کرتا ۔ تم میرے دل و جگر سے پیارہو چکی ہو ۔ تمہارے ہار کے عوض میں اپنا فوٹو زیورات کے بکس کے قریب رکھ آیا ہوں ۔ جی ہی میں مسکایا نہ دینا بنگال میں اس تصویر کو چھوڑ کر اس کے کاغذ کی بہت قیمت ہو گی ۔ محبوبہ من ! ذرا انتظار کیجئے ۔ تمہیں فریب نہیں دیا گیا ۔ ہرگز نہیں جس طرح گدائی مارنے سے اچانک نظر آ جاتی ہے اسی طرح وہاں تمہیں میرا فوٹو اچانک مل جائے گا ۔ اس کے بعد جب مسکرانا تمہارے اس تمسخر کو اپنے خیال منجذب کر کے سمندر پار جاؤں گا ۔ اور ایک لذت افروز تکرار تمہارے گھر میں چھوڑوں گا دیکھوں گا تم اپنے بھگوان کے پاس میرے لئے کتنی منگل کامنائیں کرو گی ۔ اس دفعہ یہی التدعا کرنا کہ تمہارے قریب سے جس قدر تکلیفات لے چلا ہوں ۔ ایک دن با معنی ہو جائیں ۔

تم نے دل ہی دل میں کبھی حسد کیا ہے یا نہیں مجھے علم نہیں ، یہ دوست

ہے کہ میں لڑکیوں سے محبت کرتا تھا۔ مجھے پتہ نہیں کہ وہ مجھے بھی چاہتی تھی۔ یقیناً تم میرے ساتھ محبت کرتی تھی۔ اور اس محبت نے مجھے ممنون کیا ہے مگر یہ یقینی خیال کرو۔ کہ تم انجمن رخشاں میں میرے لئے مشتری کی مانند ہو۔ یہ درست ہے کہ تمہارا امور کی وضاحت کا اب وقت نہیں ہے۔ میں شاعر نہیں میری زبان اَرٹ کی دم کی مانند ہے۔ جہاں گہری درد ہوتی ہے وہاں متانت لازمی ہے نہیں تو سچائی کا معیار کم ہو جاتا ہے۔ کمزوری چنچل ہوتی ہے کئی بار میں اپنی کمزوری دیکھ کر مسکرایا ہوں۔ تم اس خط کو دیکھ کر ایک بار مسکرا گئی کہ یہ تو ایبیک کی مانند خیالات ہیں۔ مگر پھر تمہیں منہ پر ہنسی نہیں آئیگی۔

تمہاری دوری سے کئی حسد کرتے ہیں۔ مگر دل دینے میں جسقدر ممنونیت ہے تمہارے بدل اس کا تصور نہیں ہو سکتا۔ ممکنات کے باوجود نہیں ہو سکتا یہی تیز تر تشنگی بے چینی کا باعث ہے۔ اس لئے اب تاریخ کو قبول کروں گا۔ یا نہیں کروں گا۔ مگر قبول کرنا پڑے گا۔ تم صاف طور پر مجھے بتاؤ کہ محبت کرتی ہو یا نہیں۔ مگر تمہاری خاموشی سے جو کچھ پایا ہے وہ ایک ملحد کو عرفان نہیں دے سکتا۔ اسے میں عجیب خیال کرتا ہوں۔ اسی کشش میں تمہارے بھگوان ہی واپس آ جائیں گے ٹھیک نہیں جانتا۔ مگر تنہائی خیال میں ہمارے اپنے راز در پردہ ہیں۔ چوٹ لگنے سے خیال پر خوش ہوتے ہیں یقینی طور پر یہ حقیقت ایسی ہے سب سے اتنے دنوں میں نہیں جان پایا۔

میری پیاری لذت افروز محبوبہ! دنیا میں سب سے زیادہ تمہارا محب ہوں یہی لاانداز محبت کی تمہید ہے۔ اگر اسے محسوس کیا جائے اور اسے ہی تمہارا

بھگوان کہا جائے تو اس کا اور تمہارا دروازہ ملحد کیلئے واحد رہ جائے گا۔ اب میں واپس آؤں گا پھر اپنی محبت کی مانند چشم براہ ہو کر آؤں گا تم اسے اپنے زیارتکدہ پر جا کر پہنچا دینا جس سے عقلی طور پر ایک لمحہ کے لئے بھی تم سے جدائی نہ ہو سکے آج تم سے اتنی دور آ کر میرے دل میں محبت کی تجلے نمودار ہوئی ہے۔ فضول دلیل بازی کا راستہ تم نے میرے لئے صاف کر دیا ہے۔۔۔ اب میں تمہاری معروف صفات کو دیکھ سکتا ہوں اب تک میں نے تمہیں اپنی عقل سے پہچانا تھا۔ اب میں تمہیں اپنے آپ کو متقرب کر کے پہچان رہا ہوں

تمہارا ملحد عقیدت کیش ۔۔۔ ابھیک"

اعجاز محبت

چندر کانت کچھ زیادہ عمر کے آدمی نہیں۔ لیکن بیوی کے مرنے کے بعد انہوں نے اپنی دوسری شادی نہیں کی بلکہ جانوروں کے شکار سے دل بہلانے لگے۔ ان کا جسم لمبا چھریرا اور مضبوط ہے۔ اور نظر تیز۔ اس لئے اس کا نشانہ کبھی خطا نہ کرتا۔ اس لئے ان کے ساتھ پہلوان ہری سنگھ، اچھکن لعل، استاد جان گویا، اور میاں صاحب وغیرہ بہت سے لوگ رہتے ہیں اور اسکے ساتھ ہی بیکار مصاحبوں کو بھی کافی افراط تھی۔

دو چار شکاریوں اور دوست احباب کو لیکر چندر کانت دریا کے کنارے شکار کیلئے گئے۔ دریا میں دو بڑی کشتیوں کے بیچ جا ٹھہرے۔ ان دو کشتیوں کے علاوہ چار کشتیاں اور بھی ساتھ تھیں۔ جن میں نوکر چاکر اور مصاحب ڈیرا ڈالے تھے۔ گاؤں کے بہو بیٹیوں کا نہانا دھونا ان کی وجہ سے ایک حد تک بند ہوگیا۔ بندوقوں کی تراخ پڑاخ سے بحر و بر دن بھر متزلزل رہتا تھا۔ اور شام کو استادوں کی تانوں سے گاؤں کے رہنے والوں کی نیند حرام ہوتی تھی۔

چندر کانت ایک دن صبح سویرے اپنی کشتی میں بیٹھے اپنے ہاتھ سے بندوق کی نالی صاف کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں قریب سے بطخ کی آواز سنائی دی آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ ایک لڑکی دونوں ہاتھوں سے دو بطخیں سینے سے لگائے گھاٹ پر کھڑی نظر آئی۔ ندی چھوٹی تھی۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس میں پانی بہہ نہیں سکا کہیں

کہیں مختلف قسم کی کاہی پھیلی تھی۔ لڑکی نے دونوں بطخوں کو پانی میں چھوڑ دیا لیکن لیکن اس خیال سے کہ کہیں ہاتھ سے نکل کر دور نہ چلی جائیں۔ انہیں قریب ہی رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس سے پہلے وہ انہیں پانی میں چھوڑ کر چلی جایا کرتی تھی۔ لیکن آج کل شکاریوں کے خوف سے چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔

اس لڑکی کی اٹھان میں دلکشی تھی۔ گویا قدرت نے اسے ابھی سانچہ میں ڈھالکر روح پھونکی ہے۔ اس کی عمر کا اندازہ لگانا آسان نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے چہرہ پر ایسا بھولا پن برستا تھا جیسے ابھی وہ دنیا کے رنگ ڈھنگ سے ناواقف ہے اور جوانی کے آنے کی خبر تک نہیں رکھتی۔

لمحہ بھر کیلئے چندر کانت بندوق کی نالی صاف کرنا بھول گئے معلوم ہوتا تھا کہ خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایسی دلکش جگہ اور یہ موہنی صورت انہیں خواب میں بھی یہ امید نہیں تھی۔ لیکن کسی روجہ کے محل کی بجائے یہ چہرہ یہاں ہی بہتر معلوم ہوتا تھا۔ سونے کے گلدستہ کی نسبت پھول جھاڑی پر ہی خوشنما معلوم ہوتا ہے اس دن جاڑوں کی شبنم کے قطرات اور صبح کی دھوپ سے ندی کے کنارے کا نظارہ نہایت ہی دلفریب معلوم ہوتا تھا۔ چندر کانت وہ بھولا بھالا چہرہ دیکھ کر مست ہوگیا۔

لیکن وہ لڑکی حیرت زدہ ہو کر رونی صورت بنائے دونوں بطخیں لے کر منہ ہی منہ میں کچھ گنگناتی ہوئی گھاٹ سے تیز گام ہو کر چلدی چندر کانت نے سبب معلوم کرنے کے لئے کشتی کے باہر آ کر دیکھا۔ ان کا ایک پیارا مصاحب محض دل لگی سے ان بطخوں کی طرف نشانہ باندھ رہا تھا۔ چندر کانت نے فوراً پیچھے سے بندوق چھین کر اس کے رخسارہ پر ایک تھپڑ رسید کیا اتفاقاً رنگ میں بھنگ دیکھ کر وہ

صاحب وہاں سے چل دیا۔ اور چندر کانت پھر کشتی میں جاکر بندوق صاف کرنے لگا

تھوڑی دیر میں چندر کانت نے ایک کبوتر پر نشانہ لگایا کبوتر چھرہ لگنے سے کچھ فاصلہ پر جاکر گر گیا۔ چنانچہ شکار کا پتہ لینے کے لئے چندر کانت اس چھوٹے سے گاؤں میں گیا اسے کافی محنت کرنی پڑی کیونکہ ایک گھر کے دروازہ پر پیپل کے نیچے وہی لڑکی بیٹھی ہوئی نظر آئی اس کی گود میں وہی گھائل کبوتر تھا۔ اور لڑکی پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی کبوتر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ اور قریب ہی کے درخت کے پاس کھڑے پانی کے گڑھے سے آنچل بھگو بھگو کر کبوتر کے منہ میں پانی نچوڑ رہی تھی۔ قریب ہی ایک بلی دونوں پاؤں پھیلائے للچائی نظروں سے تاک میں بیٹھی تھی۔ لیکن لڑکی انگلی دکھا دکھا کر اس کی نشست کو بار بار توڑ دیتی۔

گاؤں میں دوپہر کے سناٹے میں اس منظر کو دیکھ کر چندر کانت بہوت سا ہو گیا۔ درخت کے پتوں سے دھوپ چھن چھن کر لڑکی پر پڑ رہی تھی۔ قریب ہی ایک موٹی تازی گائے گھاس چر کر جگالی کرنے بیٹھی تھی اور سر اور کان ہلا کر مکھیاں اڑاتی جاتی تھی۔ ہوا سے ہلتے ہوئے پتوں کی سرسراہٹ کی آواز آ رہی تھی یہ وہی جو لڑکی ندی کنارے جنگل کی پری نظر آتی تھی۔ وہ یہاں دوپہر کو مجسمہ محبت اور گھر کی دیوی نظر آ رہی تھی۔

چندر کانت بندوق لئے ہوئے اس لڑکی کی طرف بڑھتے چلے گئے لیکن تھوڑی دور جاکر وہ جھجک کر رک گئے۔ اس وقت ان کی کیفیت اس چور کی طرح تھی جو مال مسروقہ سمیت پکڑ لیا جائے۔

اس کے دل میں خیال آیا کہ کسی طرح ثابت کیا جائے کبوتر اس کی بندوق سے

زخمی نہیں ہوا - ابھی چندر کانت سوچ ہی رہا تھا کہ اس کو کیونکر چھیڑیں کہ کسی نے
گھر کے اندر سے آواز دی "سدھا" لڑکی یہ سن کر جیسے چونک پڑی پھر آواز آئی
"سدھا" یہ سنکر وہ لڑکی جلدی کبوتر لے کر گھر چلی گئی - چندر کانت نے دل میں کہا
نام تو بہت ہی پیارا ہے سُدھا ،

چندر کانت کشتی پر واپس آیا - بندوق رکھی اور پھر اسی گھر کے دروازہ پر
موجود ہوا کیا دیکھا کہ ایک سر گھٹے پنڈت جی جن کی صورت اطمینان کے سانچے میں ڈھلی
دکھائی دیتی تھی - چبوترہ پر بیٹھے بھگوت مال پڑھ رہے تھے - چندر کانت نے پنڈت جی
کے مقدس چہرہ کو جس سے سنجیدگی اور متانت عیاں تھی - اس لڑکی کے چہرہ سے
جس سے رحم مترشح ہوتا تھا - مقابلہ کیا اور پنڈت جی کو نمسکار کر کے بولے سدھا
ٹھن! پیاس لگی ہے کیا لوٹا بھر پانی مل سکتا ہے -

براہمن نے تعظیم و تکریم سے بٹھایا - اور اندر سے کچھ بتاشے اور لوٹا بھر پانی
لا کر مہمان کے سامنے رکھ دیا - چندر کانت پانی پی چکے تو پنڈت جی سے پوچھا
آپ کون ہیں - انہوں نے اپنا پتہ بتا کر پنڈت جی سے کہا ۔۔۔ اگر میں آپ کی کوئی
خدمت کر سکتا ہوں تو اس کا بجا لانا فخر سمجھوں گا -

پنڈت جی کا نام "نوین چندر مشر جی" تھا بولے ۔۔ بیٹا تم میری کیا خدمت کر
سکتے ہو میری صرف سدھا نامی لڑکی ہے اس کو کسی کے پلے باندھ دینا ہی ایک کام
باقی ہے - آس پاس کے مقامات میں کہیں کوئی اچھا لائق خاندانی لڑکا دکھائی نہیں
دیتا - دور جا کر پتہ لگانے کی استطاعت نہیں گھر میں بھگوان کی مورتی ہے اسے چھوڑ کر کہیں جا تا نہیں ہو سکتا
چندر کانت ۔۔۔ اگر آپ مجھ سے کشتی پر مل سکیں تو میں ایک اچھا خاندانی لڑکا بتا

سکتا ہوں۔

چندر کانت نے گاؤں میں جاسوس چھوڑ رکھے تھے۔ انہوں نے جس سے پوچھا اس نے سدھا کے چال چلن کی تعریف کی

دوسرے دن نوبل چندر جب کشتی پر آئے تو چندر کانت نے ڈنڈوت کر کے بٹھایا اور باتوں ہی باتوں میں جتایا۔ کہ وہ ان کی لڑکی سے شادی کرنے کا آرزومند ہے۔ پنڈت جی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی سن کر حیران ہو گئے خیال ہوا چندر کانت کو دھوکا ہوا ہے۔ پوچھنے لگے: تم میری لڑکی سے شادی کرو گے؟

چندر کانت — اگر آپ رضامند ہیں تو میں تیار ہوں

نوبل چندر — سدھا کے ساتھ

چندر کانت — ہاں

نوبل چندر — (اطمینان سے) تم نے ابھی تک تو اسے دیکھا سنا نہیں ہے

چندر کانت نے اس انداز سے کہ گویا واقعی اسے نہیں دیکھا تھا۔ اسکی آپ فکر نہ کریں

نوبل نے خوش ہو کر کہا۔ کہ میری سدھا تو بہت اچھی لڑکی ہے گھر گرہستی کے کام میں کوئی اس کا جواب نہیں جیسے تم اس کو بغیر دیکھے بیاہنے کو تیار ہو ویسے ہی میں بھی یقین رکھتا ہوں۔ کہ میری سدھا ہمیشہ میری رضا جوئی کر کے تم کو خوش و خرم رکھے گی

ماگھ کے مہینہ میں شادی قرار پائی۔

گاؤں کے رئیس ججودار بابو کے گھر بیاہ کا سامان تیار کیا گیا۔ اور جب وقت آیا

تو پالکی پر سوار۔ روشنی اور باجے گاجے کے ساتھ دولہا آن پہنچا۔

شادی کے وقت ایک بار مانگ میں سیندور لگانے کے موقع پر دولہا نے دلہن کی طرف دیکھا سر عاشرم سے سر جھکائے تھی اس لئے چندر کانت اسے اچھی طرح نہ دیکھ سکے جوش مسرت سے آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

خاندان کی رسم تھی کہ دولہا گھر میں جا کر منہ جھٹلایا کرتا تھا چندر کانت کو جب اندر جانا پڑا تو ایک عورت نے زبردستی دولہا سے دلہن کا گھونگھٹ کھلوایا پردہ کا ہٹنا تھا کہ چندر کانت جیسے چونک پڑے ۔۔۔ یہ تو وہ لڑکی نہیں ہے جسے اچانک اس پر بجلی گری معلوم ہوا کہ دم بھر میں وہاں کی روشنی بجھ گئی ہے اور تاریکی نے عروس تو کا چہرہ بھی چھپا لیا ہے۔

چندر کانت نے دل میں عہد کیا تھا۔ کہ دوسری شادی نہیں کروں گا مقدر نے اس عہد کو دل لگی سے فی الفور خاک میں ملا دیا۔ بہت سے اچھے اچھے پیغام آئے لیکن چندر کانت نے منظور نہ کئے ۔ دولت کا لالچ اور حسن کی دلفریبیاں اس کے ارادہ میں تزلزل پیدا نہ کر سکیں۔ بلند مرتبہ خاندانوں سے تعلق کا خیال اس کے استقلال میں لغزش پیدا نہ کر سکا لیکن آخر کار ایک گاؤں جس سے وہ واقف نہ تھا بلکہ ایک ایک ناواقف گھر میں اسے ذلیل ہونا پڑا۔ اب لوگوں کو کیسے منہ دکھاؤں گا

پہلے سسر پر غصہ آیا۔ کہ مکار نے لڑکی دکھائی اور شادی کی اور اس کے ساتھ پھر خیال آیا۔ نہیں چندر نے لڑکی تو دکھائی ہی نہیں تھی وہ بیاہ سے پہلے لڑکی دکھانے کو راضی تھے لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔ اب اپنی عقل کے قصور کو کسی پر ظاہر نہ کرنا چاہیئے۔ زہر کا گھونٹ پی گیا۔ چہرہ کا رنگ فق ہو گیا سسرال کی عورتوں کا ہنسی مذاق تھا

معلوم ہونے لگا۔ کچھ خود پر اور کچھ اوروں پر غصہ آرہا تھا۔

اسی اثنا میں اس کی دلہن جو پاس ہی بیٹھی تھی کسی نامعلوم خوف کے باعث زور سے چیخ اٹھی اور ایک خرگوش کا بچہ اسکے پاؤں سے دوڑتا ہوا نکل گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس دن والی لڑکی دوڑتی ہوئی آئی۔ اور خرگوش کے بچہ کو پکڑ کر گال پر گال رکھ کر پیار کرنے لگی۔ یہ کہہ کر وہ پگلی آگئی اُس سے سب عورتیں اشارہ کر کے وہاں سے چلے جانے کو کہنے لگیں مگر اس نے اس پر دھیان نہ دیا۔ دُلہا دُلھن کے سامنے بیٹھ گئی۔ اور بچوں کی طرح شوق سے دیکھنے لگی کہ کیا ہو رہا ہے ایک عورت نے اُسے پکڑ کر زبردستی وہاں سے ہٹانا چاہا۔ مگر چندر کانت نے کہا کیوں ہٹاتی ہو اسے بیٹھے رہنے دو۔ اسکے بعد اس لڑکی سے مخاطب ہوتے۔ تمہارا نام کیا ہے؟

لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا اس کا منہ دیکھنے لگی اور جتنی عورتیں وہاں بیٹھی تھیں سب ہنس پڑیں۔

چندر کانت سے پوچھا — تمہاری بطخیں اچھی ہیں۔

اُس نے کچھ جواب نہ دیا اور بے تکلف ٹکٹکی باندھے دیکھا کی۔

چندر کانت نے ہمت کر کے پُوچھا — تمہارا وہ کبوتر اچھا ہو گیا۔ اس کا بھی کچھ جواب نہ ملا سب عورتیں اس طرح ہنسنے لگیں کہ دُولہا کو بہت بڑا دھوکہ ہوا ہے۔

آخر کار دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ لڑکی گونگی اور بہری ہے گاؤں کے چرند پرند ہی اسکے ساتھی ہیں۔ اس دن سدھا کی پکار سنکر وہ گھر چلی گئی تھی تو یہ محض اس کا خیال تھا۔

چندر کانت یہ سن کر دل ہی دل میں کافی حیران ہوا۔ جسکے نہ ملنے سے وہ دنیا کو ہیچ سمجھتا تھا۔ تقدیر کی خوبی ہے۔ اسی سے نجات پا کر اس نے اپنی خوش قسمتی پر ناز کیا اور

اپنے دل میں کہنے لگا اگر میں اس لڑکی کے باپ کے پاس پہنچتا اور میری التجا پر اس لڑکی کو کسی طرح میرے گلے مڑھنے پر راضی ہو جاتا تو کیا ہوتا۔

جب تک اسے اس لڑکی کے ہاتھ سے نکل جانے کا رنج تھا اس کی محبت نے بے چین کر رکھا تھا۔ اپنی بیوی کے بارہ میں بے پرواہ تھے۔ اس کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ انہیں اس کی بھی پرواہ نہ تھی کہ اُن کی بیوی کے پاس کوئی سامان بھی نہیں ہے۔ لیکن جیسے ہی اُس نے سُنا کہ وہ لڑکی گونگی اور بہری ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جو سیاہ پردہ پڑا ہوا تھا اُٹھ گیا۔ دل ہی دل میں شکرانہ بجا لائے اور موقع پا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا اس وقت انہیں اپنی بیوی لکشمی سے زیادہ خوبصورت نظر آئی اور اتنی دیر کے بعد انہیں سمجھ میں آیا کہ یہ نوین چندر کی شخصیت کا اثر تھا۔

دلدوز محبت

کافی دور سمندر کے درمیان ایک جزیرہ ہے وہاں صرف تاش کے بادشاہ تاش ہی کی بیگم یکّا اور غلام رہتے ہیں۔ دو کی۔ تکی سے لیکر نہلا، دہلا تک اور بھی کئی گنز گرہستی کے لوگ آباد ہیں۔ لیکن وہ اعلےٰ خاندان سے نہیں۔

اکا، بادشاہ اور غلام یہ تین بڑے اعلےٰ قسم کے خاندان ہیں۔ دہلا وغیرہ چھوٹے خاندان کے ہیں جو ان کے ساتھ بیٹھ نہیں سکتے۔

لیکن حد بندی کافی بہتر ہے۔ کسی کی کتنی قدر و قیمت ہے یہ بہت پہلے سے ہی مقرر ہو چکا ہے اس میں سے کوئی بھی ذرا حیل و حجت کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ ہر ایک اپنے مقررہ فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہے یہ سب کچھ اپنے بزرگوں کے نقش قدم پرے کر کے فقیر بن کر چلتے ہیں جیسے الف، بے، پے، جیم کے پڑھنے والا لڑکا تختی پر لکھے ہوئے حروف پر ہاتھ چلاتا رہتا ہے۔

وہ کام کونسا ہے مختلف ممالک کے لوگوں کو اس کا سمجھنا مشکل ہے۔ اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھنے پر تو یہ کھیل معلوم دے گا۔ صرف قاعدہ کے مطابق چلنا پھرنا اور قاعدہ کے مطابق آنا جانا اور قاعدہ کے موافق اٹھنا بیٹھنا، بس۔ غیر معلوم تحریک خود بخود انہیں چلاتی ہے اور وہ اپنا اپنا مقررہ کام کرتے چلے جاتے ہیں۔

اُن کے چہروں پر کسی قسم کے تخیلات کے نقوش جیسا انہیں ہوتے ایک

ہی قسم کے خیالات کی مُہر ثبت ہے جیسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے والی کوئی تصویر ہو۔ باوا آدم کے زمانہ سے ایندم تک سر کی ٹوپی سے لے کر پاؤں کے جوتا تک جوں کا توں ویسے ہی بنے ہیں۔

کسی کو کبھی سوچنا نہیں پڑتا۔ غور کرنے کی مصیبت ان کے درپیش نہیں۔ سب کے سب صم بکم احساسات سے عاری چلا پھرا کرتے ہیں گرتے وقت بلا آہٹ چپکے سے گر جاتے ہیں اور اپنے منہ کو آسمان کی طرف کرتے ہوئے ایسے ہی معلوم دیتے ہیں جس طرح وہ چلنے پھرنے میں دیدے پھاڑے نظر بازی میں مصروف ہیں۔

کسی کی کوئی امید نہیں۔ خواہش نہیں۔ خوف نہیں اور نئے راستہ پر چلنے کی ضرورت نہیں ہنسی نہیں۔ رونا نہیں۔ شک وشبہ نہیں۔ اور رہم و رجا نہیں۔ پنجرہ میں جیسے پرندے پھڑپھڑاتے ہیں ان کی شکل وصورت سے زندہ ہستیوں کی اس قسم کی کوئی بھی حیرت اور استعجاب کی حرکت نمایاں نہیں ہوئی۔

لیکن جب کبھی ان پنجروں میں ذی حس وجود بند کئے تھے تو پنجرا جھولتا تھا۔ اندر سے پرندوں کے پر پڑانے اور چہچہانے کی ترنم ریزی ــــ سنائی دیتی تھی۔ شاداب جنگل اور کھلے آسمان کی خوشنمائی یاد آئی تھی ــــ اب صرف پنجرے کی پُرنفرت اور ڈراڈائی لوہے کی تاروں کا ہی۔ اس ہوا کرتا تھا۔ پرندے اڑ گئے یا مر گئے یا دائمی حیات حاصل کر گئے یہ کون کہہ سکتا ہے۔ غضب کا سناٹا ہے از حد سکون اور آرام ہے۔ کافی تسکین ہے، راستہ

ہیں، سفر میں، گھر میں اور آنگن میں ہر جگہ ہوا سرسراہٹ سے ہچکولے لے رہی ہے کہیں کوئی آواز نہیں، حرکت نہیں۔ تحریک نہیں اور اصرار نہیں، صرف روزانہ کے مقررہ کام ہیں اور مقررہ سکون،

سمندر کے طوفانی شور و شر سے ساحل کے کنارے پر ہزاروں جھاگ کے زمہ ٹیلے جزیرہ کو تھپک تھپک کر میٹھی نیند سلا رہے ہیں۔ پرندے پروں کو پھیلا پھیلا کر نیلے آسمان کے اندر ہر ایک شے کی نگہداشت کر رہے ہیں کافی دور اس پار نیلے رنگ سے دوسرے جزیرہ کا نشان نہایت مدھم صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ وہاں سے تکلیف و مصیبت کی آواز اور شور و شر سنائی نہیں دیتا۔

سمندر کے اس پار دوسرے ملک میں کسی قابل نفرین رانی کا ایک شہزادہ ہے وہ اپنی ماں کے ساتھ سمندر کے کنارے اپنی وطن میں بچپن کی زندگی گزار رہا ہے۔

وہ اکیلا بیٹھا ہوا دل ہی دل میں امیدوں کے جال بنا رہا ہے۔ اُن جالوں کو اِدھر اُدھر پھیلا کر خیالات کی دنیا کے نئے نئے رموز کو آشکارا کرتا ہوا اپنے گھر کے سامنے اکٹھا کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کا بے صبر دل سمندر کے کنارے آسمان کی بلندی پر پہاڑ کی چوٹیوں سے دور ہمیشہ چکر لگایا کرتا ہے۔ وہ تلاش میں ہے۔ اڑنے والا گھوڑا کہاں ملتا ہے۔ سانپ کی پیشانی میں پنہاں جوہر کیسے دستیاب ہوگا۔ دلکش پھول، سونے کا لڑکا اور چاندی کی لڑکی کہاں ملتے ہیں۔ سات سمندر دل اور تیرہ دریاؤں کے پار خوفناک دیوؤں کے محل میں خوابیدہ شہزادی دلدوز

انداز میں کشتی سے کہاں سو رہی ہے۔

شہزادہ مدرسہ میں پڑھنے جاتا ہے وہاں سے واپس آکر سوداگر کے بیٹے سے دراز ممالک کی باتیں اور کوتوال کے لڑکے سے بے سر پیر کی کہانیاں سنتا ہے۔

چھم چھم مینہ برستا اور بادلوں سے مطلع ابر آلود ہو جاتا ہے۔ گھر کے دروازہ پر ماں کے پاس بیٹھ کر سمندر کی طرف دیکھتا ہوا راجکمار کہتا ہے ـــــ

ماں! کوئی دوسرے ملک کی کہانی سناؤ؟ ماتا کافی دیر تک اپنے بچپن کی شنید کسی دوسرے ملک کی کہانی سناتی ـــــ بارش کی پُر زور بوچھاڑ میں اس کہانی کو سن کر شہزادے کا دل اداس ہو جاتا ہے۔

ایک روز ایک سوداگر کے لڑکے نے شہزادہ سے آکر کہا ـــــ پڑھنا تو ختم ہو چکا دوست! اب تو مختلف ممالک کی سیاحت کو جاؤں گا۔ تم سے الوداع لینے آیا ہوں۔

شہزادہ نے کہا ـــــ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔

کوتوال کے لڑکے نے کہا: "کیا مجھے اکیلا ہی چھوڑ جاؤ گے؟ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔

شہزادہ نے اپنی مصیبت زدہ ماں سے کہا ـــــ میں سیر و سیاحت کے لئے جا رہا ہوں ـــــ اب تمہاری مصیبت کو دور کرنے کی کوشش کرونگا۔

تینوں دوست مل کر چل پڑے۔

سمندر میں سوداگر کی بارہ کشتیاں تیار تھیں جن پر تینوں دوست اپنے

مال و متاع کے ساتھ روانہ ہوئے۔ جنوبی ہواؤں کا زور تھا۔ کشتیاں اسی سمت کو شہزادہ کے تخیل سے تیز تر دوڑ رہی تھیں۔ "شنکھ دویپ" کے جزیرہ میں ایک کشتی شنکھوں سے بھر لی گئی۔ چندن کے جزیرہ میں ایک کشتی چندن سے بھر لی گئی۔ مونگا کے جزیرہ میں ایک کشتی مونگوں سے بھر لی گئی۔

اس کے بعد جاوا میں جب کستوری، لونگ، جائفل اور ہیروں سے کشتیاں بھر لی گئیں تو اچانک سمندر میں ایک زبردست طوفان نمودار ہوا ساری کشتیاں ڈوب گئیں صرف ایک کشتی باقی رہ گئی۔ جس نے تینوں دوستوں کو ایک جزیرہ میں بڑی پُرخطر حالت میں پہنچایا۔ لیکن اس کے بعد وہ کسی کام کی نہیں رہی تھیں۔

اس جزیرہ میں تاش کے اکّا۔ تاش کے بادشاہ۔ تاش کے غلام اور تاش کی بیگم مقررہ قواعد کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے اور دہلا نہلا وغیرہ بھی ان کی خدمت اچھے ڈھنگ سے بجا لایا کرتے تھے۔

تاش کی حکومت میں اب تک کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا مگر اب پہلے پہل جھگڑا اور تکرار کی داغ بیل ڈالی گئی۔

کچھ دنوں کے بعد یہ دلیل —— کہ تینوں آدمی جو اچانک ہی ایک روز سمندر سے نکل کر آئے ہیں انہیں کس قسم میں شمار کیا جائے؟

سب سے پہلے تو اس معاملہ پر غور کرنا ہے کہ ان کی نوعیت کیا ہے — اکّا بادشاہ، غلام یا نہلا دہلا۔

دوسرے ان کی نسل کا سوال تھا کہ کیا وہ کُکم، چڑی، پان یا اینٹ کی نسل میں مخلط ہو سکتے ہیں۔

ان امور پر غور کرنے کے بغیر انکے ساتھ کسی قسم کا تعلق پیدا کرنا مشکل ہے۔ یہ کن کے ساتھ رہیں اور ان کی کمائی میں شریک ہوں ان میں سے حقوق کے لحاظ سے کون کسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ کون شرقی ہے کون مغربی۔ کون جنوبی ہے اور کون شمالی صوبہ سے تعلق رکھتا ہے اور کون کس سمت سوئے اور کون کھڑے کھڑے نیند سے ہم آغوش ہوا کرے ان سب امور کا قطعاً کوئی فیصلہ نہیں ہوتا تھا۔

اس حکومت میں اس سے پیشتر اس قسم کا پیچیدہ معاملہ درپیش نہیں آیا تھا۔ لیکن بھوک کی وجہ سے تڑپتے ہوئے ان غیر ملکی دوستوں کو ذرا بھر بھی فکر نہیں تھا۔ انہیں کسی طرح کھانے کو مل جائے تو جان میں جان آئے جب انہوں نے دیکھا کہ لوگ انہیں کھانا دینے میں ہچکچاہٹ کرتے ہیں۔ کوئی موزوں راستہ نکالنے کے لئے ایکانے ایک زبردست اجتماع کیا ہے۔ تب انہوں نے اپنا یہ معمول بنا لیا کہ جہاں جو کچھ ملے کھا پی لیا جائے۔ انکی اس قسم کی حرکات سے دوکی، تکی حیرت زدہ ہو گئی۔ تکی نے کہا بھائی دو کا ان کو تو کوئی خیال ہی نہیں ہے۔ بڑے بدتمیز واقع ہوئے ہیں۔ دوکی نے کہا —— بھائی تکی اس سے تو صاف واضح ہوتا ہے۔ کہ یہ لوگ ہم سے بھی پست درجے کے ہیں۔

کھا پی کر ان تینوں رفیقوں نے دیکھا کہ اس ملک کے آدمی کچھ نئے ہی رنگ ڈھنگ کے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اس قسم کے لوگ ہیں ہی نہیں۔ یا شاید انکے فرق پر کسی نے نقش پا مٹی کی ہے اور یہ کم عقل دنیا کے لوازمات سے بے رُخ ہو کر

جھوم جھوم کر گھوم رہے ہیں جو کچھ بھی کرتے ہیں۔ جیسے کوئی دوسرا آدمی ہی کر رہا ہے۔ ان کی حالت پتلیوں کے کھیل کی طرح خود بخود رقص کناں ہونے سے مشابہت رکھتی ہے۔ اسی لئے کسی کے چہرہ پر کسی قسم کی حس و حرکت اور خیالات و جذبات کا اثر دکھائی نہیں دیتا۔ اور سب کے سب کسی متین انداز سے قاعدہ کے مطابق چل رہے ہیں اور پھر بھی یہ مل کر حیرت افروز معلوم ہوتے ہیں۔

چاروں طرح زندگی کی بے حس و حرکت تصویر دیکھ کر شہزادہ نے آسمان کی طرف منہ کرکے زور سے قہقہہ لگایا۔ قہقہہ کی پُر زور آواز تاش کی حکومت میں بڑی حیرت زا سنائی دی۔ یہاں کے رہنے والے کتنے متین اور سنجیدہ ہیں۔ کہ ہنسی اور مذاق سے نکلی ہوئی آواز کو سُن کر حیرت زدہ ہو رہے ہیں ——

ایک شعلہ زن جوالا بجھ گئی اور چاروں طرف شور و شر کیا پہلے سے زیادہ خاموشی اور سکون معلوم ہوتا تھا۔

دونوں دوستوں نے بے بس ہو کر شہزادہ سے کہا —— رفیق اس سر زمین خاموش پر ایک لمحہ بھی رہنے کو جی نہیں چاہتا اگر ہم یہاں دو چار روز اور رہے تو ہمیں اپنے آپ کا جائزہ لینا پڑے گا کہ کیا ہم زندہ ہیں یا مُردہ!

شہزادہ نے کہا —— نہیں، مجھے بڑی مسرت حاصل ہو رہی ہے دیکھنے ہیں یہاں کے لوگ زندہ معلوم ہوتے ہیں ان میں ایک آدھ رتی جان ہے یا نہیں اس کا پتہ چلانے کے لئے ہمیں انہیں جھنجھوڑ دیکھنا ہوگا۔

اسی طرح کچھ عرصہ گزر گیا لیکن یہ تینوں نوجوان کسی قاعدہ کے پابند نہ

رہ سکے وہاں جب جس وقت اٹھنا، بیٹھنا۔ منہ پھیرنا۔ چت پٹ ہونا اور کلابازی لگانے کا اصول جاری تھا۔ یہ ان میں سے کسی کے پابند نہ تھے بلکہ مزہ لے لے کر دیکھتے اور مخول اڑاتے۔ ان مختلف قسم کی بے ہنگم حرکتوں سے کوئی حرکت زیادہ سنجیدگی کا باعث ہو سکتی ہے یہ بات ان کے ذہن میں ہی نہیں آتی تھی۔

ایک روز اِکا۔ بادشاہ اور غلام نے آکر تینوں سے ٹوٹے ہوئے بانس کی آواز کی طرح بڑی بے سُری لیکن سنجیدہ آواز میں کہا — تم لوگ قواعد کے مطابق کیوں نہیں رہتے۔

تینوں رفیقوں نے جواب دیا — ہماری مرضی۔

تاش کی حکومت کے فرمانروا کے بڑے تعجب سے جیسے کوئی خواب سے بیدار ہوتا ہے کہا — مرضی۔

وہ سُسری کون ہوتی ہے؟

مرضی اور طبیعت کیا ہے وہ نہ سمجھ سکا۔ لیکن بعد کو تھوڑی دیر میں سمجھ گیا۔ وہ روزانہ دیکھنے لگا کہ اس طرح نہ رہ کر اور طریقہ سے زندگی بسر کرنا بھی ممکن ہے۔ جس طرح یہاں ہے اسی طرح وہاں بھی، ہاں غیر ممالک سے آئے ہوئے تین آدمیوں نے آکر بتلا دیا کہ قانون کے مطابق رہنے سے انسان کو کامل آزادی نہیں مل سکتی اس لئے وہ مرضی اور طبیعت جیسی ایک حکمران سپرٹ کے اثر سے متاثر ہو گئے ہیں۔

جونہی اس کو تجربہ ہوا تو تاش کے بادشاہ دائیں بائیں جدھر نظر اٹھائے

حیرت زدہ ہو جاتے اس طرح جیسے کوئی سانپ کے پنجہ میں پھنسے ہوئے آدمی کی آزادی کے وقت حالت ہوتی ہے۔

سادہ مزاج بیگم نے ابھی تک کسی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا ہی نہیں تھا خاموشی سے وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف تھی اب ایک روز بہار کی شام کو اس نے اپنے پلکوں کو زور سے کھول کر ستی سے شہزادہ کی طرف دیکھا تو حیرت زدہ ہو گئی۔ شہزادہ چونک کر بولا — اوہو الہیٰ یہ کیا دیکھ رہا ہوں میں تو سمجھتا تھا کہ یہ کاغذی اصنام ہیں میں نے غلط سمجھا یہ تو دلکش محبوبہ ہے۔

دونوں رفیقوں کو ایک طرف لے جا کر شہزادہ نے کہا — بھائی اس کی اوبد و چشم کی بے پناہ حرکت سے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی نئے عالم میں نئے آفتاب کو دروازہ مشرق سے قدم زن ہوتے دیکھ رہا ہوں اتنے دنوں تک تسلی سے ٹھیرنے سے آج فائدہ دکھائی دیا ہے۔

دونوں دوست بڑے مسرت زا انداز سے قہقہہ زن ہو کر بولے۔ کیا یہ سچ ہے ؟ :

وہ بد قسمت پان کی بیگم روزانہ اپنے فرائض سے تساہل کرنے لگی اسے جب جہاں حاضر ہونا چاہیے وہ نہ پہنچتی۔ بار بار بھولنے لگی۔ چنانچہ جب اسے غلام کی بیگم کے ساتھ مل کر کھڑا ہونا چاہیے۔ وہ اچانک شہزادہ کی بغل میں جا کر کھڑی ہو جاتی۔ غلام شناخت سے عاری ہو کر کہتا ————— بی بی

تم بھول گئی ہو۔ یہ سنکر پان کی بیگم کا خون جوش سے حرکت زن ہونے لگ جاتا۔ اس کی نگاہ خود بخود شرمندگی سے نیچے جھک جاتی۔ شہزادہ جواب دیتا ـــــ غلطی نہیں ہوئی بلکہ آج سے میں ہی غلام ہوں۔

فی الفور دل خوش کن انداز سے یہ کس قسم کے جذبات نکل رہے ہیں اور یہ کس قسم کا مزاج ہو رہا ہے۔ اس کی طبیعت میں یہ کیسی دلدوز تبدیلی نمودار ہوئی۔ اسکے آنکھ کے اشارے میں مستانہ ترنگوں کی کیسی لپٹیں اُٹھ رہی ہیں اور اس کے وجود سے کس قسم کی فطری مسرت کا طوفان موج خیز ہو رہا ہے۔

غلطی کی تلافی کے لئے آج کل ہر ایک کو شبہ لاحق ہونے لگا۔ اِکّا اپنی عزت کے تحفظ میں لگا ہوا تھا بادشاہ اور بیگم میں اب کوئی تمیز ہی نہ رہی تھی۔ اور نہلا دہلا کو نہ معلوم کیا ہو گیا ہے۔

اس پرانے جزیرہ میں بہار کے موسم میں کوئل نے کتنی بار چہچہا کر ترنم ریزی کی تھی۔ لیکن اس دفعہ اس نے ایسی نرالی آواز سے گانا گایا جیسا اس سے کبھی نہیں گایا تھا۔ سمندر ہمیشہ سے ایک ہی قسم کی راگنی آلاپ رہا تھا اتنے عرصہ سے وہ پرانی ڈفلی بجا رہا تھا لیکن آج یہ جنوبی ہواؤں سے جوانی اور شباب کی ترنگوں کی روشنی اور تاریکی میں اٹھتی ہوئی مستی سے اچھلنے لگا۔

کیا یہی وہ اِکّا ہے۔ یہی وہ بادشاہ ہے، یہی غلام ہے کہاں گئی وہ خاموشی اور سکون کی حالت۔ کوئی آسمان کی طرف دیکھتا ہے تو کوئی سمندر کے کنارہ پر بیٹھا ہے کسی کو رات کو نیند نہیں آتی اور کسی کو کھانے میں بہترین ذائقہ نہیں آتا۔

کسی کے منہ پر حسد کی اور کسی کے منہ پر محبت کی لہر دوڑ رہی ہے کوئی بےچین ہے تو کسی کو کوئی شبہ لاحق ہے کہیں ہنسی ہے تو کہیں رونا ہے کبھی کوئی اپنی اور کبھی کوئی دوسروں کی طرف دیدے پھاڑ کر دیکھ رہا ہے اور ہر ایک اپنے حالات کے ساتھ دوسروں کا توازن کرنے میں منہمک ہیں۔

اِکا سوچ رہا ہے کہ نوجوان بادشاہ دیکھنے میں تو بُرا نہیں ہے لیکن اس کے چہرہ سے خوبصورتی کے دلکش آثار دکھائی نہیں دیتے ـــــ میرے چال چلن میں ایک ایسی برائی ہے کہ بعض آدمیوں کی نگاہ میری طرف کھچے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔

بادشاہ سوچ رہا ہے کہ اِکا ہمیشہ بڑے غرور سے گردن ٹیڑھی کئے ہوئے چہل قدمی کیا کرتا ہے وہ سمجھتا ہوگا کہ اُسے دیکھ بیگموں کا دل ٹھکانے نہیں رہتا ہوگا ـــــ دل ہی دل میں للکتا ہوا ذرا ترچھی ہنسی ہنستا ہوا آئینہ میں اپنی شکل وصورت دیکھتا۔

ملک بھر میں جتنی بھی بیگمات تھیں ہر ایک بناؤ سنگار کرتی اور ایک دوسرے کو خوبصورت کہتی تھیں ـــــ ارے ساس رہنے بھی دو کیوں مری جاتی ہو۔ تمہاری اتنی سج دھج کس لئے ہے؟ شکل وصورت دیکھ کر تو شرم آتی ہے کہ باوجود کوشش کے خیالات کے اظہار سے باز نہیں رہ سکتی تھیں۔

کسی جگہ دو دوست اور کسی جگہ دو سہیلیاں مل کر گلے میں ہاتھ ڈالے تنہائی میں بیٹھ کر چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ کبھی ہنستے کبھی روتے اور کبھی غصہ کرتے اور کبھی غرور وتکبر دکھایا جاتا اور بعد کو پھر تسلی کرائی جاتی۔

نوجوان سڑک کے کنارے درختوں کے سائے میں اور جھاڑیوں کے

قریب کھڑے ہوئے سوکھے پتوں پر پاؤں پسارے تساہل سے بیٹھے رہتے ہیں۔ پُرشباب لڑکیاں آسمانی کپڑے زیب تن کئے سایہ میں سستی سے چلتی پھرتی ہیں اور وہاں پہنچ کر آنکھیں پھیر لیتی جس طرح کسی کو دیکھ ہی نہیں رہی ہیں اور نہ دیکھنا چاہتی ہیں۔ لیکن اٹھکیلیاں کرتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔

یہ دیکھ کر کئی پاگل نوجوان مستانہ انداز سے جلدی جلدی قریب پہنچتا لیکن دل میں آئی ہوئی ایک بات بھی یاد نہیں رہتی۔ شرمندہ ہو کر کھڑے ہو جاتا۔ حالات موافق نہیں رہتے اور دوشیزہ بھی دور پہنچ کر متحیر ہو جاتی۔

آسمان پر پرندے چہچہاتے۔ ہوا دامن پھیلا کر گھونگر والے بالوں اڑاتی ہوئی سناتی ہوئی چلی جاتی۔ درختوں کے پتے جھرجھراتے ہوئے سرکتے اور سمندر کی لہراتی ہوئی موجیں دلی جذبات کو زیادہ پُرجوش کر دیا کرتیں۔

بہار میں آکر تین رفیقوں نے خشک دریا میں تلاطم بپا کر دیا تھا۔

شہزادہ نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ طوفان میں سارا ملک ہچکولے لے رہا ہے کوئی منہ سے کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن ایک دوسرے کو دیکھ کر کوئی ایک قدم بڑھاتا ہے تو دوسرا چند قدم پیچھے ہو جاتا ہے۔ صرف تخیلات کے قلعے تعمیر کر کے مسمار کئے جاتے ہیں۔ سب کے سب اپنے گھر کی آنچ میں اپنے آپ کو قربان کر کے گرمی حاصل کرنے کی دھن میں ہیں۔ دل ہیں ان حیرت زدہ اور متحیر ہو رہے ہیں صرف آنکھیں چل رہی ہیں اور وہ جوشِ مسرت سے شکل و صورت میں ایک بے پناہ تبدیلی پیدا کرتی چلی جاتی ہیں۔

شہزادہ نے سب کو بلا کر کہا ——— آؤ۔ بنسی بجاؤ۔ آنکھ مچولی کریں کچھ

گائیں بجائیں۔ پان کی بیگم کا بیاہ ہوگا۔

اسی وقت نہلا اور دہلا نے اپنے قبیلہ میں اس خبر کو مشتہر کر دیا۔ ڈگی ٹگی وغیرہ ساز بجانے لگ گئیں اور اچانک ہی مسرت اندوز آواز سے وہاں کی چہ میگوئیاں ختم ہو گئیں۔

جشن میں عورت مرد سب مِل کر کتنی باتیں، کتنے مذاق۔ کتنی مزاح کرنے لگے ہنسی کھیل میں ہی کتنی دل کی باتیں کہہ دیں اور ناز و انداز سے کتنا یقین اُٹھ گیا اور زبردست ہنسی میں کتنی فرسودہ باتیں ہوتی رہیں گھنے جنگل میں زوردار ہوا کی سرسراہٹ سے جس طرح آواز آتی ہے ویسی ہی اس جگہ کیفیت دکھائی دے رہی تھی۔

ایسے شور و شر اور جشن میں صبح سے ہی شہنائی بجنے لگی اس مسرت میں تانت بے جیتی دنیا کی دلکشی اور دلوں میں محبت کی آبیاری ہوتی۔ جو اچھی طرح محبت نہیں کرتے تھے وہ خوب پریم کرنے لگے اور جو پریم کرتے تھے وہ مسرت میں سرمست ہو اُٹھے۔

پان کی بیگم رنگین پوشاک زیب تن کئے ہوئے پوشیدہ درختوں کے سایہ میں بیٹھی تھی اس کے کانوں میں بھی دُور سے شہنائی کی آواز آ رہی تھی۔ اور آنکھوں میں مستانہ خواب موجود تھا اچانک اس نے آنکھ کھول کر دیکھا تو سامنے بیٹھا ہوا شہزادہ اس کی طرف متوجہ ہے اس پر کپکپی چھا گئی۔ دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا کر زمین پر لوٹ پوٹ گئی۔

شہزادہ نے ساحل کی موجوں سے نظارہ بازی کرتے ہوئے جب بیگم کو اس

حالت میں دیکھا تو وہ دل ہی دل میں اس پر تنقید کرنے لگا۔

رات کو ہزاروں، لاکھوں، شمعوں کی روشنی میں پھولوں کی خوشبو میں بنسی کی تان میں سرمست زینت افروز نوجوانوں کی مجلس میں ایک لڑکی آہستگی سے کانپتے ہوئے مالا ہاتھ میں لے کر شہزادہ کے سامنے آکر آنکھ جھکا کر کھڑی ہوگئی۔ ابھی گلے تک مالا نہیں پہنچی تھی اور نظر بھر کر شہزادہ کو بھی دیکھ نہ سکی تھی کہ اس نوجوان نے خود بخود سر جھکا دیا اور مالا اس کے گلے میں زینت افروز ہوگئی اور خاموش انجمن دلکش ترانوں سے سرمست ہو اٹھی۔

سب نے بڑے جوش سے دولہا دلہن کو ملا کر آسنوں پر بٹھایا۔ اور شہزادہ کی سب نے مل کر توصیف کی۔ سمندر پار کی مصیبت زدہ رانی سونے کی کشتی پر سوار ہو کر شہزادے کی نئی حکومت میں پہنچی۔

تصویروں کی شکلیں اچانک آدمی بن گئیں۔ یہاں پہلے کی طرح تسکین اور آرام نہیں۔ دنیا کے سیل رواں نے آرام و مصیبت خوشی اور غم کے ساتھ ساتھ شہزادہ کی نئی بادشاہت میں ولدوز نعرہ بلند کیا اب کوئی اچھا ہے۔ کوئی بُرا ہے اور سب کے سب آدمی ہیں۔ فرشتے نہیں بلکہ سب اپنی خواہش اور طبیعت کی تحریک پر اپنے فرائض کو ادا کرنے میں منہمک ہیں۔"

درد و محبت

وصل کے پہلے دن بنسری نے کہا تھا:

اس نے کہا تھا ــــــــ "دہلی آدمی میرے پاس آیا ہے جو دور کا مسافر تھا"

"اور کہا تھا ــــــــ پکڑنے پر بھی جو گرفت میں نہیں آتا اُسے پکڑ لیا ہے

اور حصول کے باوجود جو اس سے دور ہے اسے پا لیا ہے"۔

اس کے بعد پھر روزانہ کیوں بنسری کی دلگداز آواز نہیں آتی۔

کیونکہ میں آدھی بات تو بھول گیا ہوں۔ صرف یہی یاد ہے ــــ وہ قریب

ہے مگر کافی بعد رکھتا ہے اس راز کا خیال تک نہ رہا۔

پریم کے جس برزخ میں وصل ہوا ہے۔ اسی کو دیکھتا ہوں جس حالت میں بڑھا

کی چوٹ دل پر لگتی ہے اس کا خیال ہی نہیں جاتا۔ اس لئے دور سے تشنہ کام

ہو کر دیکھتا ہوں ــــ وہاں تقریب کے پردہ نے راستہ میں دیوار حائل کر دی ہے،

دو آدمیوں میں جو بے پناہ فاصلہ ہے وہاں بالکل خاموشی ہے۔ وہاں زبان

بے زبانی کارفرما ہے۔ اُس گہری خاموشی کو بنسری کی تان سے لبریز کر دیا جاتا ہے

مگر لامحدود افلاک کی حدیں آپس میں مل نہ جائیں۔ تو بنسری ہی نہیں بجتی۔

ہمارا وہ عالم برزخ طوفان اور گرد و غبار سے اٹا پڑا ہے۔ روزانہ کے کام

کاج اور چیت سے آئے دن کے خوف اور حقارت سے لبریز ہو گیا ہے۔

کبھی کبھی دن ماہتابی شب میں ہوا فراٹے بھرتی ہے اس وقت بستر پر بیدار ہو کر بیٹھے رہنے سے دل پگھل جاتا ہے۔ اس وقت یاد آتی ہے اس آدمی کو تو بالکل کھو ہی ڈالا۔

درد فرصت کس طرح کم ہو ـــــ میرے دل سے اسکے دل کا بعد المشرقین؛ دن کے آخری حصہ میں کام کاج سے فراغت کے بعد جس سے محو گفتار ہوتا ہوں وہ کون ہے؟ وہ تو دنیا کے ہزارہا افراد میں سے ایک ہے میں نے اُسے جان لیا ہے پہچان لیا ہے۔
لیکن اس میں کہاں ہے میری وہ کبھی نہ ختم ہونے والی ایک وحدت اُسے پھر سے نئے انداز سے کہاں کس خیال سے کیسے تلاش کر کے ڈھونڈوں؟
اس کے ساتھ پھر ایک بار کس وقت بات کروں ـــــ جنگلی پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو میں کونسی شام فرصت کی تاریکی سے لبریز عالم میں؟

اتنے میں بوندا باندی بادِ شمال سے بادلوں کو اڑاتی ہوئی افق مشرق پر مسلّط ہو گئی۔ اجین کے شاعر کالیداس کی یاد آئی۔ سوچا، محبوبہ کے پاس پیغام بھیجدوں میرے گیت اڑتے ہوئے ہوا کے ہلوروں سے پرواز کر کے ـــ تقرب اور بُعدِ اقرب کی حدِ فاصل کو بھی پار کر جاتے ہیں۔
مگر اس وقت تو گانے کے لئے جانا پڑے گا ـــــ رقت کے سرچشمہ کے بجائے بانسری کی لے کے اس پر درد نالہ کی ابتدا ان زمانوں کے دلوں والے نہاں عالم منکشف کی بہر بخشش بہار کے روح پرور جھونکے چہار اطراف سے عالم نور و سرور کو

مجتمع کر دیتے ہیں۔ کیتکی کے جنگل کی بہاریں پٹیں عجلت سے بڑھتی ہوئی آتی ہیں۔ سنسان دریا کے کنارے ناریل کے جنگل کی مرمریں سرسراہٹ کے پُرنم جھونکے میرے پیغام کو ـــــ درد بھرے پیام کو محبوب کے کانوں تک پہنچا دیں۔ جہاں وہ اپنی بکھری ہوئی سیاہ زلفوں کو سنبھال کر ان میں گرہ دے کر کمر میں آنچل باندھے اپنے دنیوی کاموں میں محو کار ہے۔

کافی دور کا بے پناہ آسمان آج قدرت کی نیلگوں کائنات کے سرہانے جھکا ہوا۔ کانوں ہی کانوں میں کہنے لگا ـــــ "میں تمہارا ہی ہوں۔"

زمین نے کہا ـــــ "وہ کس طرح؟ تم تو بے پناہ ہو اور میں محدود۔"

آسمان نے کہا ـــــ "میں نے چاروں طرف بادلوں کی حد بنا دی ہے۔"

زمین بولی ـــــ "تمہارے پاس تو ستاروں کی کافی تعداد ہے میرے پاس تو روشنی کا کوئی خزانہ نہیں ہے۔"

آسمان نے کہا ـــــ "آج میں اپنے آفتاب، ماہتاب اور ستارے سب کھو آیا ہوں۔ آج میری تم ہی ایک واحد ترہو۔"

زمین بولی ـــــ "میرا غم سے لبریز جگر ہوا کی ہر ایک سرسراہٹ سے چنچل ہو کر لرزنے لگتا ہے۔ مگر تم تو غیر متزلزل ہو۔"

آسمان کہنے لگا ـــــ "میرے آنسو بھی آج تھمتے نہیں ہیں۔ دیکھتی نہیں ہو۔ چپلے ہوا اٹھے ہیں۔ میرا قلب آج نیلگوں ہو گیا ہے۔ تمہارے اس نیلگوں دل کی طرح۔"

یہ کہ اس نے زمین اور آسمان کے بعد کو آنسوؤں کے گیت سے بھر ڈالا۔

اس زمین اور آسمان کے بیاہ کے منتروں کی آواز دلکشی کو لے کر نئی بارش کیوں نہ ہمارے فراق پر اتر آئے محبوبہ! جو کچھ ناقابل بیان ہو وہ خود بخود زبان سے بین کے تار کی طرح چونک پڑے وہ اپنی پیشانی کی مانگ پر نبات کے رنگ کی مانند اپنا نیلگوں آنچل ڈھانک لے۔ اس کی کالی آنکھوں کی چتون سے بادلوں کی لڑی بے قابو ہو اٹھی۔ تم کامیاب ہو جاؤ —— اس کی زلفوں میں گرہ گیر ہو کر جب جھینگروں کی جھنکار سے خاموش بیابان کی تاریکی رزنہ ہی ہو جب بارش کی نم آلود ہوا سے چراغ کی لو لرزتے لرزتے بجھ جائے تب وہ اپنی نہایت تریں دنیا کو چھوڑ کر نہ آئے —— بھینی بھینی گھاس کی خوشبو سے لبریز جنگلی راستہ سے میرے ساکن دل کی تاریک تر رات میں آئے۔ اور بڑھ بڑھ کر آئے۔ اور بڑھ بڑھ کر آئے۔ میں ہاتھ پسارے کھڑا ہوں۔

اشاراتِ محبّت

شامِ زندگی

کائنات! مَیں نے تیری گل و گلزار کی مہکتی ہوئی پھلواڑی سے ایک پھول توڑا۔ مَیں نے اُسے اپنے دل و جگر سے لگا لیا مگر اس کا ایک کانٹا میرے قلب مضطر میں چُبھ گیا۔

شام ہوئی۔ آہستہ آہستہ تاریکی غالب آنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ پھول تو مرجھا گیا ہے درد اُسی طرح بنا ہوا ہے۔

دُنیا! تیری گلزار میں اور بھی کئی خوشبودار پھول کھلیں گے۔ لیکن میرا گل چینی کا وقت گزر گیا ہے۔

زندگی کی شام کے بعد اس اندھیرے میں میرے پژمردہ پھول بھی میرے پاس نہیں ہیں لیکن درد آج تک اسی طرح جلا رہا ہے۔

ملاقات

نیچے جمنا کا پانی بہہ رہا ہے۔ قریب ہی پہاڑیوں پر گھنا جنگل تھا۔ گرو گوبند چٹان پر بیٹھے شاستر چرچا کر رہے تھے۔ ان کا دولتمند شاگرد رگھوناتھ

آیا۔ اور قدمبوس ہوکر بولا ——— میں اپنا حقیر نذرانہ لایا ہوں۔ اگر یہ نذرانہ آپ قبول کریں"۔

اس نے گورو دیو کے قریب ہیروں سے جڑے ہوئے دو طلائی کڑے رکھ دیئے۔ گورو دیو نے ایک کو ہاتھ میں اٹھا لیا۔ جواہرات سے ضیا نکل رہی تھی۔ گورو دیو کڑے کو دیکھ کر ہاتھ میں گھمانے لگے۔ کڑا ہاتھ سے چھوٹ کر پانی میں جا گرا۔ "کیا ہوا" کہہ کر رگھوناتھ پانی میں کود پڑا۔ گرو دیو تسکین قلبی سے پھر شاستر چرچا کرنے لگے۔

شام ہوگئی۔ رگھوناتھ واپسی پہ گورو دیو کے پاس آیا۔ اس کے سارے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ ہانپتے ہوئے وہ بولا ——— اگر آپ بتائیں کہ کڑا کدھر گیا تو میں اب اسے نکال لاؤں"۔

گورو دیو نے دوسرے کڑے کو پانی میں پھینک کر کہا ——— "ہاں"۔

کمل

سردی نے کمل کے پھول کو خراب کر ڈالا۔ سارے تالاب میں صرف ایک کمل کا پھول کھلا ہوا تھا۔ زندگی کی بازی لگا کر سوداس تالاب میں گھس گیا اور کمل توڑ کر شاہی محل کی طرف بیچنے کے لئے چلا۔

راستہ میں ایک مسافر ملا اور کہنے لگا ——— کمل کی کیا قیمت لوگے مالی؟ میں اسے بھگوان کے قدموں پر چڑھاؤں گا"۔

سوداس نے کہا ——— "ایک طلائی مہر"۔

مسافر نے مُہر نکالی۔

اسی وقت شاہی محل سے مہاراج اس طرف آ نکلے اور بولے ——

مالی کمل کا کیا دام لوگے؟

مالی نے ایک مُہر لینے کی بات کہی۔ مہاراج اس طرف آنکلے اور بولے

تو مسافر نے اس سے بھی دگنی قیمت لگا دی۔

مالی کے جی میں آیا۔ سوچا —— جن چرنوں میں چڑھانے کے لئے یہ لوگ کمل کی اتنی قیمت چڑھا رہے ہیں۔ ان کی پرستش میں ہی کیوں نہ کروں"؟

اس نے کہا —" دیو! معاف کیجئے میں کمل نہیں بیچوں گا"۔

آم کے درخت کے نیچے شہر کے باہر بھگوان کے قریب سوداس جا کھڑا ہوا۔ بھگوان کے چہرے پر بے پناہ تسکین کے آثار نمایاں تھے آنکھوں سے جیسے محبت کا چشمہ بہ رہا تھا۔ سوداس نے کمل کا پھول چرنوں میں رکھ دیا اور بھگوان کے سامنے پیشانی جھکا کر سر بسجود ہو گیا۔

بھگوان نے مسکراتے ہوئے پوچھا —— "میرے محب! تم کیا چاہتے ہو"؟

سوداس نے خوشی میں سرمست ہو کر کہا "شری چرنوں کا سپرش!"

بھکارن

شراوستی میں سخت قحط پڑا۔ بھگوان بدھ نے اپنے شاگردوں سے

پوچھا ــــ "بھوک سے اٹھائے ہوئے لوگوں کو کھلانے کا بوجھ کون اُٹھائے گا۔"

جگت سیٹھ اننا کرنے سر جھکا کر کہا ــــ "میرے پاس جتنی دولت ہے اگر اس سے کچھ زیادہ ہو تو ان مصیبت زدگان کی حفاظت ہو سکتی ہے"۔

سپہ سالار جے سین نے کہا ــــ "میں اپنے جسم کے خون کا آخری قطرہ تک قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔ مگر گھر میں اتنا اناج نہیں ہے"۔

بڑے بھاری کسان دھرم پال نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ــــ بارش کے نہ ہونے سے میرے سارے کھیت خشک ہو گئے ہیں معلوم نہیں کہ بالیانہ کیسے ادا کروں گا"۔

اس وقت بھکارن کی لڑکی آ حاضر ہوئی سب کو پرنام کر کے نہایت آہستگی سے بولی: "یہ بوجھ میں اٹھاؤں گی"۔

لوگوں نے حیران ہو کر کہا ــــــــــــ "کیسے؟ تم یہ ناقابل بیان بار کیسے اٹھاؤ گی"؟

بھکارن نے جواب دیا ــــ میں نہایت غریب ہوں۔ میری غربت ہی میری قوت ہے۔ میرا خزانہ تم سب کے گھروں میں ہے"۔

پارس کی تلاش

ایک مبہوت الحواس آدمی پارس کی تلاش کر رہا تھا۔ اس کے بال تک اُلجھ گئے تھے جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ ہونٹ خشک اور ایک دوسرے

سے چپکے ہوئے تھے۔ صرف آنکھوں میں کچھ نور تھا اور معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی کی تلاش کر رہا ہے۔

سامنے بے پناہ سمندر تھا۔ لہریں موجزن تھیں اس کی آواز جیسے بے انداز جواہرات کی رام کہانی زبان حال سے کہہ رہی تھی۔ اگرچہ اس کی زبان کو کوئی سمجھنے والا نہیں تھا۔

بے چارا مایوس تو ہو ہی چکا۔ مگر مایوسی سے بھی تسکین نہیں ملی تھی۔

جس طرح سمندر اپنی بے پناہ لہروں سے بلند آہنگ ہو کر جس طرح آسمان سے بغلگیر ہونا چاہتا ہے جس طرح ستارے محو گردش رہتے ہیں۔ مگر اپنی منزل کو نہیں پاتے۔ بالکل اسی طرح یہ پریشان آدمی تھا یا اس کی تلاش میں بے چین ہو کر پھر رہا تھا۔

ایک دن گاؤں کے لڑکوں نے اس کے قریب آکر پوچھا ــــ "بابا" یہ سونے کی زنجیر تم نے کہاں سے پائی ہے؟"

بے چارا چونک پڑا۔ دراصل اس کی لوہے کی زنجیر سونے کی ہو گئی تھی یہ خواب نہیں تھا۔ اصل واقعہ تھا۔ مگر اسے یاد نہیں تھا کہ کب یہ انقلاب آیا۔

اُس نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ بدقسمت نے بالضرور پارس حاصل کر کے اُسے کھو دیا۔

کہاں ؟ کہاں ؟ کب اور کہاں پھینکا تھا ؟

اُس کی تو یہ عادت ہی ہو گئی تھی کہ پتھر اٹھاتا۔ زنجیر کو اس سے چھوتا اور پھر پتھر کو پھینک دیتا۔

آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ آسمان زرین شفق سے سُرخ ہو گیا تھا بیچارا پاگل پھر واپس لوٹا اور پارس کی تلاش کرنے لگا۔

ساری قوت کھو چکا تھا جسم لاغر ہو گیا تھا۔ دل میں ذرا بھی طاقت نہیں تھی۔ اکھڑے ہوئے پودوں کی طرح وہ ادھر اُدھر اڑا پھرتا تھا۔

تلاش

نصف شب گزر چکی تھی، سنیاس لینے کے لئے کمر بستہ خانہ دار نے خواب سے بیدار ہو کر کہا۔ گھر بار چھوڑ کر بھگوان کی تلاش کا وقت آپہنچا۔ مجھے آج تک کسی نے اس دنیائے دوں کی دلفریبی کا اسیر کر رکھا تھا۔

بھگوان نے آہستگی سے کہا ــــ "میں نے" لیکن اس بیچارے کے کانوں میں یہ آواز نہ پڑی۔

بستر پر خانہ دار کی بیوی بے سدھ ہو کر محو خواب تھی اور اس کی گود میں ایک دودھ پینے والا بچہ تھا۔ خانہ دار نے ان کی طرف دیکھ کر کہا ــــ "تم کون ہو۔ جنہوں نے آج تک مجھے محبت میں ڈالے رکھا۔"

آہستگی سے پھر ایک آواز آئی ــــ "یہ بھی ایشور ہی ہیں۔" لیکن اس نے پھر بھی ان الفاظ کو نہ سُنا۔

بچہ خواب میں ڈر کر ماں کی گود میں ٹھٹھک گیا۔ ماں نے سوتے ہوئے

ہی اسے سینہ سے رگا لیا۔

بھگوان نے پھر حکم دیا ـــــ بیوقوف ٹھہر، اپنا گھر بار نہ چھوڑ، لیکن خانہ دار کے کانوں تک شاید یہ الفاظ بھی نہ پہنچے۔

آہ بھر کر بھگوان نے کہا ـــــ " میرا سیوک مجھے چھوڑ کر میری تلاش میں کیوں جا رہا ہے ؟"

خانہ دار اب گھر سے باہر جا چکا تھا۔

اولاد

گنگا کے کنارے بھگت سناتن بیٹھے رام نام کا ورد کر رہے تھے ایک نہایت غریب برہمن نے آکر صدا لگائی ـــــ میری امداد کیجئے میں کنگال ہوں"۔

برہمن نے کہا ـــــ مگر خواب میں اُمیدوں کو بر لانے والے مہادیو نے درشن دیا تھا اور حکم دیا کہ آپ کے پاس آکر استدعا کروں۔

سناتن کو یاد آیا کہ گنگا کے کنارے پتھروں میں سے انہیں ایک بیش قیمت ہیرا ملا تھا اور انہیں یہ سوچ کر انہوں نے ریت میں دبا دیا تھا۔ کہ کبھی کسی کے کام آجائیگا۔

برہمن کو اشارہ سے وہ جگہ بتا دی جہاں ہیرا گڑا تھا۔ برہمن خوشی سے وہ جگہ کھودنے لگا۔ ہیرے کو دیکھ کر برہمن حیران رہ گیا۔ بیٹھ کر نامعلوم کیا سوچنے لگا شام ہو گئی غروب آفتاب کا وقت آیا۔ چرواہے ریوڑ لیکر گاؤں کی طرف چلے فی الفور برہمن اٹھا اور بھگت سناتن کے پاس آکر بولا ـــــ

سوامی اس بیش قیمت دولت کا ایک تھوڑا سا حصہ مجھے دیجئے۔ جسے جا کر آدمی دنیا کی دولت کو ٹھکرا دیتا ہے۔

برہمن نے ہیرا پانی میں پھینک دیا۔

مرتاض

بدھ بھگوان کے شاگرد اُپ گپت متھرا کے باہر زمین پر لیٹے ہوئے تھے چراغ گل ہو چکے تھے۔ دروازے بند ہو گئے تھے اور آسماں پر بادل چھائے ہوئے تھے۔

کسی جھنکار کے ساتھ پاؤں اس کے جسم سے چھوئے آنکھ کھل گئی انہوں نے دیکھا ایک عورت چراغ ہاتھ میں لے کر سامنے کھڑی ہے۔

وہ متھرا کی ایک پر شباب رقاصہ تھی۔ زیورات سے ملبوس۔ وہ ایک آسمانی رنگ کی ساڑھی زیب تن کئے ہوئے تھی۔

چراغ کو زمین پر رکھ کر اس نے نوجوان مرتاض کو بڑی سکون قلبی سے دیکھا — تپسوی مجھے معاف کرو۔ اٹھو میرے گھر چلو۔ سخت زمین تمہارے آرام کے لئے نہیں ہے۔

مرتاض نے جواب دیا — دیوی اپنی راہ لو! وقت آنے پر میں تم سے آملوں گا۔

بجلی چمکی اور اس کی چمک میں رات کی سیاہی اور واضح ہو گئی۔ آسمان کی ایک طرف طوفان سا اٹھتا دکھائی پڑا اور عورت ڈر گئی۔

شاہی راستہ کے درختوں پر پھول لدے ہوئے تھے دُور سے بنسری کی میٹھی آواز ترنم ریز تھی۔ باشندگان شہر جنگل میں بسنت کا جشن منانے لگے تھے چاند اپنی ضیاباریوں کا کمال دکھا رہا تھا۔ آم کے درخت پر کوئل بیٹھی الاپ رہی تھی۔ مرتاض اکیلا پھر رہا تھا۔

جاسوسس شہر کے دروازہ سے نکل کر باہر آئے۔ یہ کون تھی جو باہر پڑی تھی؟ سارا جسم زخموں سے چُور تھا۔

مرتاض اس کے قریب بیٹھ گیا اس کے سر کو اپنے گھٹنوں پر رکھ کر اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دینے لگا۔

"رحم کی مجسم تصویر! تم کون ہو جس نے میری سدھ لی؟"

"دیوی! میں ہوں جاسوسس! وقت آگیا ہے اور میں تم سے آملا ہوں۔

طویل مصیبت

گھاس سے سرسبز راستہ پر میں اکیلا پھر رہا تھا ـــــ کسی نے پیچھے سے کہا ـــــ "مجھے پہچانتے ہو؟"

مَیں نے مڑ کر دیکھا ـــــ "نہیں تمہارا نام تو یاد نہیں آتا" میں نے کہا۔

بولی ـــــ "مَیں وہ مصیبت ہوں جسے جوانی میں پہلے پہل تم نے جھیلا تھا" اس کی آنکھوں میں وہ سادگی تھی جو صبح کی شبنم میں نظر آتی ہے۔

تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر میں نے پوچھا ـــــ "کیا تمہارا آنسوؤں

کا ناقابل بیان بوجھ کم ہو گیا؟"

وہ مسکرانے لگی۔ کچھ کہا نہیں میں سمجھ گیا کہ وقت پا کر آنسوؤں نے مسکرانے کی زبان سیکھ لی ہے۔

اس نے آہستگی سے کہا ـــــ "کیوں ایک بار کہتے تھے تاکہ یہ مصیبت مجھے ابھی فراموش نہیں ہو گی"۔

میں نے شرمسار ہو کر جواب دیا ـــــ "ہاں مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یادداشت نے مجھے سمجھا دیا۔

پھر میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا ـــــ "مگر تم بھی تو بدل گئی ہو"۔

"جو کبھی زمانہ میں مصیبت تھی اور اب جاتی رہی ہے" ـــــ اس نے کہا۔

ازالہ

مصور میلے میں تصویر فروخت کر رہا تھا اپنے ملازموں کے ساتھ شاہی وزیر کا لڑکا بھی میلے میں، وزیر نے اپنی جوانی میں مصور کے باپ کو دھوکہ دیا تھا جس کے غم میں مدغم ہو کر وہ ناگہانی موت کا شکار ہو گیا تھا۔

نوجوان تصویروں کو دیکھنے لگا اور ان میں سے ایک نے پسند کیا مصور نے اس پہ پردہ ڈال کر کہا ـــــ "میں اسے فروخت نہیں کروں گا"۔

نوجوان مایوس ہو کر چلا آیا اور غم میں چور ہو گیا۔ شاہی وزیر خود میلے میں آیا۔

اور بیش قیمت جواہرات دینے پر تیار ہو گیا۔ پھر بھی مصور نے تصویر فروخت نہ کی اور کہا ـــ یہی میرا ازالہ ہے"۔

مصوّر ہمیشہ اپنے معبود کی تصویر بنایا کرتا تھا یہی اس کی ریاضت تھی۔

اس نے دیکھا کہ تصویر کی کیفیت بدلنے لگی ہے وہ غمگین ہو گیا۔ کوشش کے باوجود خیال کے برعکس تصویر بننے لگی۔ ایک دن اس نے حیران ہو کر دیکھا کہ معبود کی آنکھوں اور لبوں کا نقش شاہی وزیر سا ہو گیا تھا

مصوّر نے سر دھن کر کہا ـــ میرا ازالہ میرے ہی سر رہا"۔

سورگ کہاں ہے؟

شمشان سے فراغت کے بعد پتا گھر آئے۔

سات سال کے بچے نے متفکرانہ انداز میں تنہا پتا کی طرف دیکھا۔ پتا نے اسے گود میں اٹھا لیا۔

بچے نے پوچھا ـــ" اماں کہاں ہے"؟

روندھے ہوئے گلے سے آسمان کی طرف دیکھ کر انگلی آسمان کی طرف اُٹھا کر پتا نے جواب دیا ـــ"سورگ میں"۔

رات کے وقت غم سے چور پتا خواب میں بھی کراہتے تھے۔ خواب گاہ کے دروازہ کے پاس ایک چراغ ٹمٹمارہا تھا اور ایک چھپکلی سینگ دیوار پہ چپ چاپ

رہی تھی۔

بچہ بیدار ہو گیا اور بستر کو سونا پاکر رونے لگا اور اکیلا چھت پر چلا گیا آسمان کی طرف دیر تک دیکھتا رہا۔ اس کا فکر میں غلطان خیال رات کی تاریکی سے زبان بے زبانی سے سوال کر رہا تھا ـــــ سورگ کہاں ہے۔

جواب نہ ملا۔ اس بے پناہ تاریکی کے غم میں تارے بھی ٹمٹما رہے تھے۔

بد اعتماد

رات ڈھلتے ڈھلتے گزر رہی تھی۔

میرے دل نے مجھے تسلی دینی چاہی بولا ـــــ سب جھوٹ ہے۔

مجھے غصہ آگیا میں نے کہا ـــــ وہ اس کا خط، وہ اسی کے ہاتھوں کا بنایا ہوا پنکھا کیا یہ سب جھوٹ ہے۔

دن بھی گزر گیا۔ میرا دوست مجھ سے ملنے آیا بولا ـــــ جو سچ ہے وہ برحق اور لافانی ہے۔"

میں نے جھنجھلا کر پوچھا ـــــ کیسے جانتے ہو کہ وہ خوش خصالی اور خوشنما لافانی ہے؟ کیا اس کا خوبصورت جسم اچھا نہیں تھا جو موت کے گھاٹ اتر گیا۔

چڑے ہوئے بچے کی مانند جو غصہ میں اپنی حفاظت کرنے والی ماں کو ماں کو مارنے لگتا ہے میں ان تمام اشیا کو توڑنے پھوڑنے لگا جن سے

مجھے قدرے تھوڑی سی بھی راحت ملی تھی اور چلایا ——— دیناد مہو کے کی ٹی بے "

فی الفور ایک آواز آئی ——— احسان فراموش

میں نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ اور ایسے معلوم ہوا جیسے تاریک رات میں سے کوئی کلانی جاں گداز آواز میں کہہ رہا ہے ——— میری غیر موجودگی کے گڑھے میں تم اپنا یہ اعتماد بھی ڈال دیتے تو میں تمہارے ساتھ تھا۔

بھگوان

اس دیوتا کا رتھ شہر کے چاروں طرف چکر لگانے والا تھا مہادیوی نے مہاراج سے کہا ——— "چلئے" رتھ یاترا" دیکھ آئیں

سب پیچھے چل دیئے۔ صرف آدمی نہیں گیا۔ وہ تھا شودر جو جاڑوں کے لئے تنکے اکٹھے کر رہا تھا۔

خدمت گاروں کے سردار نے شرم سے کہا ——— تم بھی آسکتے ہو شودر

اس نے سر جھکا کر کہا ——— نہیں دیوا

شودر کی جھونپڑی کے سامنے ہی سب رتھ کی یاترا دیکھنے جاتے تھے جب وزیر اعظم کا ہاتھی اس کی جھونپڑی کے قریب آیا۔ تو وزیر نے پکار کر کہا ——— شودر ادھر یاترا کے وقت دیو درشن کرلے

راجاؤں کی طرح میں دیو درشن نہیں کرتا سوامی ——— اس نے جواب دیا۔

بھلا تمہیں دیو درشن پھر کب قسمت میں دیکھنے کو لکھا ہوگا؟
جب بھگوان میرے جھونپڑے کے دروازہ پر آگئیں گے نا تھا
وزیر نے حیرت سے کہا۔۔۔ بے عقل! تیرے دروازے پر بھگوان خود درشن دینے آئیں گے مہاراج ان کے درشنوں کے لئے رتھ یاترا میں شامل ہونے جارہے ہیں
شودر نے دبی آواز میں جواب دیا۔۔۔ بھگوان کے علاوہ اور کون غریب کے گھر آتا ہے سوامی!

ضبطِ محبت

میرے خیالات ازحد اس بیوہ کی طرف جو سامنے کے مکان میں رہتی تھی۔ عظمت سے عاری تھے۔ کم از کم میں اپنے دل میں ایسا ہی خیال کرتا تھا اور اسی کا ذکر میں نے اپنے رفیقوں سے بھی کیا۔

میرا عزیز ترین دوست نابن بھی میرے دلی جذبات سے واقف نہیں تھا اور مجھے ایک قسم کا فخر تھا۔ کہ میں اپنے جذبات کو اپنے دل کی گہرائیوں کے گوشہ میں پنہاں کر سکتا ہوں۔ اور وہ شبنم آلودہ پھول .... ایسا پھول جو قبل از وقت چٹک گیا ہو .... مشابہت رکھتی تھی۔ چونکہ انسانی جذبات پہاڑی دریا سے زیادہ تلاطم خیز ہوا کرتے ہیں۔ اور روانی کے وقت روکے سے بھی نہیں رک سکتے۔ اپنا راستہ بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ تھی۔ کہ میں نے اپنے جذبات کے اظہار کی کافی کوشش کی لیکن میرا قلم لکھنے سے رکتا تھا۔ ایک ہستی جس کی عظمت کا خیال میرے دل پر نقش ہو چکا تھا۔

اتفاق اور عجیب اتفاق کی بات ہے۔ کہ اس موقعہ پر میرے دوست نابن کے سر پر شاعری کا بھوت سوار ہوا۔ غریب پر یہ پہلا حملہ تھا۔ وہ ردیف قافیہ سے بالکل واقف نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے ارادہ

سے باز نہ رہ سکا۔ اس سلسلہ میں اس نے میری مدد چاہی اشعار کا نفسِ مضمون بھی وہی پرانا۔ دقیانوسی جو ہمیشہ تازہ رہتا ہے اس کی شاعری درحقیقت محبوب کے وصل و فراق پر منتج ہوا کرتی تھی۔

میں نے ہنسی سے اس کی کمر پر ہاتھ مار کر دریافت کیا۔ کہو دوست وہ کون ہے!

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ـــ یہ مجھے بھی ابھی تک معلوم نہیں۔

مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ اپنے دوست کی مدد کرنے میں مجھے کافی راحت ملی۔ اس مرغی کی طرح جو بطخ کے انڈوں پر بیٹھی ہو۔ میں نے اپنے تمام دلی جذبات کی بھڑاس نابن کی ترجمانی کے بہانے نکال دی نابن تعجب سے کہتا ہے "ٹھیک ہے بالکل یہی میں کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہ سکا۔ تعجب ہے اس قسم کے خیالات تمہیں کہاں سے مل گئے۔

بہ حیثیت ایک شاعر کے میں جواب دیتا ـــ یہ سب میرے تخیل کی پیداوار ہے

نابن عجیب تعجب زا ہو کر کہتا ہے۔ ہاں ٹھیک ہے

اور پھر تھوڑی دیر سوچ کر کہتا ـ یہی تم ٹھیک کہتے ہو

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں میری محبت . . . جس میں ایک قسم کا وقار پنہاں تھا . . . . . . تحریری صورت میں اپنے خیالات کے اظہار سے مانع تھی۔ لیکن نابن کو ذریعہ بنا لینے کے بعد میرے علم کی روانی کے

لئے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اور اصل جذبات اشعار کی صورت میں ظاہر کرنے لگے۔

نابن اپنے مسرت کے لمحات میں کہتا ——— لیکن یہ اشعار تو آپ کے ہیں۔

مجھے آپ کے نام سے ہی چھپوا دیجئے۔

بیہودہ ——— میں جواب دیتا ——— یہ تمہارے ہی میرے دوست! میں نے تو صرف ایک آدھ جگہ اصلاح کر دی ہے۔ نابن کو اس سے آہستہ آہستہ یقین آ گیا۔

میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا۔ کہ میں نے بسا اوقات نظر اٹھا کر بیوہ کے گھر کی طرف دیکھا۔ اور یہ بھی صحیح ہے اور اس کے زینت افروز چہرہ کی درخشندگی نے میرے دل کی گہرائیوں سے تمام فرسودہ خیالات ایک نظم کا نور کر دیئے تھے۔

لیکن ایک دن میں استعجاب میں غرق ہو گیا۔ کہ کیا میں اپنی آنکھوں سے یقیناً دیکھ رہا ہوں۔

گرمی کی جوبن اور دوپہر تھی۔ تند و تیز ہوا سرگرم خرام تھی۔ اچانک کالے بال گھٹا باندھ کر شمال مغربی گوشہ سے نمودار ہوئے۔ ایسی عجیب اور ہولناک فضا میں میری دیدہ زیب پڑوسن کھڑی باہر آسمان کے کھلے حصہ کی طرف توجہ لگائے ہوئے تھی۔

پامال جذبات کا ایک عالم میں نے اس کی تیز تر اور سیاہ چمکیلی آنکھوں

میں محسوس کیا۔ اس کے خاموش حسین چہرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ خواہشات کا حرکت زن ذی روح آتش فشاں مادہ اس کے سینہ کی پنہائیوں میں پوشیدہ ہے آہ اس کی جذبات میں ڈوبی ہوئی نگاہ جو بظاہر بادلوں کا جائزہ لے کر نظر بازی کر رہی تھی درحقیقت ایک انسانی دل کی تلاش میں محو تھی۔

وہ ناقابل بیان نظارہ دیکھ کر میں مشکل سے اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکا مجھے اب اشعار کی اصلاح سے قطعاً راحت نہیں ہوئی تھی میں کوئی قابل ستائش کام کرنے کی خواہش کر رہا تھا۔ آخر کار میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ میں اپنے آپ کو اپنے ملک کی بیواؤں کی شادی کو رواج دینے میں وقف کر دوں میں نہ صرف اس موضوع پر لکھنے یا تقریریں کرنے پر آمادہ تھا۔ بلکہ میں تو مالی امداد کیلئے بھی مستعد تھا۔

نابن نے میری مخالفت کی "بیوگی" وہ کہتا اپنے اندر ایک صداقت اور ایک سکون پوشیدہ رکھتی ہے خاموش حسن ایسا خاموش جیسے قبرستان کی خاموشی گیارھویں شب کے چاند سے زیادہ منور حسینہ، کیا دوبارہ شادی کا خیال اس فطری حسن کو کہیں کم نہیں کر دیگا

اس قسم کے خیالات مجھے برافروختہ کر دیتے۔ تجھلے کے زمانہ میں اگر مرفع الحال شخص کھانے اور غربت کی تضحیک اڑائے۔ اور ایک فاقہ کش کو مشورہ دے کر بجائے کھانے کے پھولوں کی خوشبو اور پرندوں کی خوش الحانی سے لطف اندوز ہو تو آپ ایسے شخص کی نسبت کیا رائے قائم نہ کریں گے۔

میں نے کسی قدر تیز ہو کر کہا ——— دیکھو نابن تمہارا یہ خیال دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کرنے سے ٹھیک ہو سکتا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ ہر ایک بیوہ انسانی جذبات سے لبریز دل رکھتی ہے ایسا دل جس میں غم و مسرت کا احساس ہو۔

میرا خیال تھا کہ ہماری گفتگو طول پکڑ جائیگی۔ اور نابن کو سمجھانے میں مجھے کافی وقت لگیگا لیکن مجھے حیرت ہوئی۔ جب نابن میرے نہایت مختصر گفتگو کے اختتام پر صرف ایک لمحہ بھر اداکر میری رائے سے متفق ہو گیا۔ اور مجھے مزید گفتگو کی ضرورت نہ ہوئی۔

ایک ہفتے کے بعد نابن میرے پاس آیا۔ اور کہا کہ آپ میری مدد کریں تو میں ہی ایک بیوہ سے شادی کرکے شادی بیوگان کی ابتدا کردوں۔

میں خوشی سے پھول گیا۔ اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بغلگیر ہوا اور وعدہ کیا کہ تم کو اس کام کیلئے جتنی رقم کی ضرورت ہوگی میں تمہیں دوں گا یہ سنکر نابن نے اپنا قصہ سنایا۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ نابن جس سے محبت کرتا تھا وہ کوئی جذباتی چیز نہیں تھی۔ اور یہ بھی پتہ چلا کہ نابن بھی کچھ عرصہ تک کسی بیوہ سے وابستگی کا خواہشمند تھا اس نے اپنے جذبات کا کسی تک اظہار نہ کیا۔ وہ میگزین جس میں نابن کی اور میری منظومات شائع ہوتی تھیں اس دلربا حسینہ کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ اور غزلیں اپنی اثر اندازی کے بغیر نہ رہ سکیں۔

اس نے کہا ——— درحقیقت مجھے اس بات کا بھی علم نہیں تھا کہ وہ

پڑھنا بھی جانتی ہے یا نہیں

میں اپنا نام ظاہر کئے بغیر اس کے بھائی کے پاس میگزین بھیج دیا کرتا تھا۔ اور یہ ایک بات ایسی تھی جیسے دیوی کے سامنے عقیدت کے پھول چڑھانا۔ پجاری کا یہ کام نہیں کہ وہ جستجو کرے کہ اسکے گلہائے عقیدت شرف قبولیت کے درجہ پر پہنچے یا نہیں

تابن نے تمام طور پر مجھے بتانا چاہا۔ کہ میری نظر میں کوئی خاص غرض نہیں تھی جب میں نے بیوہ کے بھائی سے مراسم بڑھائے۔ بلکہ یہ امر فطری ہے کہ جب کسی سے محبت ہو جاتی ہے اس کے عزیز بھی دلچسپ معلوم ہوتے ہیں

اس کے بعد داستان اور طویل ہو گئی کہ اس کے بھائی کی بیماری پر کس طرح آمد و رفت زیادہ ہو گئی۔ اور بعد کو بھی ملاقات کے مواقع درپیش ہوتے رہے اور کس طرح شاعر کی موجودگی اور شاعری کے بہانہ گفتگو کا موقعہ ملتا تھا

تابن تھوڑا عرصہ قبل میرے سے شکست یاب ہو چکا تھا۔ اور اس نے میری ہدایت پر بیوہ سے جسے وہ چاہتا تھا۔ شادی کر لینے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ ابتدا میں وہ بیوہ کو شادی کرنے پر رضامند نہ کر سکا۔ لیکن جب وہ ہدایت کے ذریعہ پُر زور الفاظ استعمال کر کے اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ تو پھر وہ بلا کسی شرط کے رضامند ہو گئی۔

تابن نے بتایا۔ کہ شادی کے لئے کچھ رقم کی احتیاج ہو گی۔

یہ لو —— فوراً میں نے کہا۔

لیکن تابن کہتے چلا گیا —— تم جانتے ہو ہم فی الحال کسی طرح بسر اوقات کریں گے"

میں نے حاشیہ آرائی کے بغیر ایک چک ضروریات کے موافق لکھدیا اور کہا ـــــ اچھا اب بتاؤ وہ کون ہے ؟ تم رقابت کا خیال دل سے نکال دو۔ اور یقین رکھو کہ میں شعر لکھ کر اسے نہیں بھیجوں گا۔ اگر میں شعر لکھوں گا بھی تو اس کے بھائی کے پاس نہیں بلکہ تمہارے پاس بھیجوں گا۔

بیوقوف مت بنو ـــــ نابن نے کہا۔ میں نے تم سے اس کا نام اس لئے پوشیدہ نہیں رکھا۔ کہ تم میرے رقیب بن جاؤ گے یہ بات یہ ہے کہ وہ شادی پر تو آمادہ ہو گئی تھی۔ لیکن وہ کسی قدر متفکر تھی۔ اور مجھ سے کہا تھا کہ میں فی الحال اپنے دوستوں سے اس بات کا ذکر نہ کروں۔ لیکن ـــــ اب جبکہ ہر ایک بات موافق اور طے ہو چکی ہے۔ پوشیدہ رکھنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ وہ میرے قریبی مکان میں رہتی ہے اور اگر دل آہنی پولکر ہوتا تو ضرور لپٹ جاتا۔

کیا اسے شادی سے انکار نہیں ہے ـــــ میں نے ضبط کر کے پوچھا۔

فی الحال کوئی اعتراض نہیں ہے ـــــ نابن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور کہا ـــــ یہ صرف ان اشعار کا جادو تھا کہ وہ آمادہ ہو گئی۔

میرے اشعار کچھ برے نہ تھے تم جانتے ہو ـــــ اس نے کہا۔

ـــــ کیوں کیا خیال ہے

افسوس ـــــ میں نے دل میں کہا۔

جن پر بھروسہ تھا وہی ساتھ چھوڑنے لگ گئے۔

میں نے دل میں قسم کھائی — لیکن میں کس کی قسم کھاتا۔ اس کی، اپنی خدا کی، سب یکساں تھے — میں نے قسم کھائی

سحرِ محبت

اپنے ایک رشتہ دار کے ساتھ پوجا کی چھٹیوں کے بعد سیر و سیاحت کر کے کلکتے سے واپس آ رہا تھا۔ اچانک ریل گاڑی میں ایک بابو صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ ان کی پوشش سے پہلے تو مجھے دہلوی ہونے کا شبہ ہوا۔ لیکن گفتگو سننے پر زیادہ مخمصہ میں پڑ گیا۔ دنیا کے ہر ایک معاملہ پر وہ اس طرح بے روک ٹوک رائے زنی کرتے تھے جیسے قدرت نے اسی کے مشورہ سے نظام عالم کو چلایا ہوا ہے۔ دنیا میں پوشیدہ طور پر کتنے دردناک حادثات رونما ہو گئے ہیں

"ہو ایشور! تمہارے ان اخباروں میں چھپنے
والی خبروں سے زمین اور آسمان میں کہیں
زیادہ وارداتیں ہوا کرتی ہیں۔"

ہم پہلے پہل ہی گھر سے نکلتے تھے۔ اس لئے اس کی بات چیت اور رنگ ڈھنگ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ وہ حضرت معمولی سی بات پر کبھی فلسفہ کا کبھی وید کا اور کبھی فی البدیہہ فارسی اشعار کو چسپاں کرتا جسے دیکھ کر ہماری عقل فراموش ہو جاتی ——— فلسفہ، وید اور فارسی زبان پر مجبور نہ ہونے سے زیادہ متاثر ہو رہے تھے یہانتک کہ ہم

تھیاسوفسٹ دوست کو یہ یقین ہو گیا۔ کہ ہمارے اس رفیق کا کسی خفیہ قوت سے کچھ تعلق ضرور ہے ــــــ خواہ کسی خاص میگنیزم یا روحانی قوت سے ہی ہو۔ یا غیر معلوم روح اور کسی پوشیدہ طاقت سے وہ اس غیر معمولی انسانی کی معمولی سے معمولی بات پوری توجہ اور غور سے سن رہے تھے۔ اور پوشیدہ طور پر انہیں نوٹ کرتے جاتے تھے میں نے سمجھ لیا کہ وہ آدمی بھی خفیہ طور پر اس بات کو تاڑ گیا تھا۔ اور دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔

جب گاڑی آ کر جنکشن پر کھڑی ہوئی۔ تو ہم دوسری ٹرین کی انتظار میں ویٹنگ روم میں جا کر ٹھہر گئے۔ رات کے ساڑھے دس بجے تھے معلوم ہوا کہ راستہ میں کسی حادثہ کے رونما ہونے سے گاڑی آج لیٹ ہو گئی ہے میں ٹیبل پر بستر بچھا کر ذرا سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اتنے میں اس شخص نے ایک دلچسپ قصہ چھیڑ دیا۔ اس رات کو پھر مجھے نیند ہی نہیں آئی۔

وہ کہنے لگا۔

نظام حکومت کے معاملہ میں ذرا کچھ اختلاف رائے ہو جانے سے جونا گڑھ کا کام چھوڑ کر جب میں نظام حیدرآباد میں پہنچا تو مجھے نوجوان اور مضبوط آدمی دیکھ کر سرکار نے بھڑوچ میں روئی کے محصول کا داروغہ بنا دیا۔

بھڑوچ بڑی پر رونق جگہ ہے سنسان پہاڑیوں سے لق و دق جنگل کو پاٹتی ہوئی دریا کی پر جوش موجیں مستانہ انداز میں اٹکھیلیاں کرتی اور قدم قدم پر ٹیڑھی ترچھی ہوتی تیزی سے گزر رہی ہیں اسی دریا کے کنارے

سنگ مرمر کا بنا ہوا ڈیڑھ صد زینوں کا گھاٹ اور اس کے سر پر ایک سفید مرمری محل پہاڑ کی گھاٹی کے قریب اکیلا کھڑا ہے دور و نزدیک کہیں بھی کوئی آبادی نہیں ہے۔ بھڑوچ کی روٹی کی دوکان اور آبادی یہاں سے کافی دور تھی۔

لگ بھگ اڑھائی صدی پہلے شاہ محمود دوم نے اپنی عیش و عشرت کیلئے تنہائی کو مد نظر رکھ کر اس محل کو تعمیر کیا تھا۔ کسی زمانہ میں یہاں غسلخانہ کے فوارے سے گلاب کی عرق پاشی ہوا کرتی تھی۔ اور اس دلکش خنک غسل گاہ میں گاہ میں سنگ مرمر کے چبوترہ پر بیٹھی ہوئی شباب اور ایرانی دوشیزگان اپنے نرم و نازک پاؤں کو شفاف پانی کی سطح پر ہلا ہلا اور پھیلا پھیلا غسل سے قبل اپنے لمبے سیاہ گھونگر والے بالوں کو بکھیر کر ستار گود میں لے انگور بیل کی طرح بڑھتی اور جھومتی ہوئیں غزل سرائی کیا کرتی تھیں۔

اب وہ فوارے نہیں چلتے تھے۔ وہ گیت سنائی نہیں دیتے تھے اور نہ ہی عہد گزشتہ کی طرح مرمری چبوترے پر شباب اور دوشیزہ ماہ پاروں کے قدم بوسہ باری کے عمل کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ اب وہ ہمارے جیسے غزل و نغمہ سے عاری گوشۂ تنہائی میں دھکیلتے ہوئے چورنگی کا کمروں کی ایک کشادہ اور خاموش قیامگاہ ہے۔ مگر دفتر کے بوڑھے کلرک کریم خاں نے مجھے اس محل میں رہنے سے کئی بار منع کیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ طبیعت چاہے تو دن میں ٹھہریے مگر رات ہرگز نہ بسر کیجئے۔ میں نے اس کی ہدایت کو مخول میں اڑا دیا تو کہوں کہا کہ شام تک تو وہ کام پر رہیں گے لیکن رات یہاں ہرگز نہیں

سکتے۔

میں نے کہا ـــــــ ایسا ہی سہی یہ مکان اتنا بدنام تھا کہ رات کو چور تک کبھی چھپنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔

پہلے پہل جب میں اس خوفناک پتھروں کے محل میں پہنچا تو اس کی تنہائی میرے جذبات قلب پر ایک گراں بوجھ کی طرح بیٹھ گئی۔ مجھ سے جہاں تک ہوا نہ باہر کے کام کاج سے تھک کر رات کو یہاں واپس آیا کرتا اور آتے ہی سو جاتا۔

ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا۔ کہ اس محل کی ایک تعجب زا مستی سے متواتر میں اپنے آپ کو مسحور ہوتا محسوس کرتا۔ میری اس حالت کا اندازہ ٹھیک نہیں ہے۔ اور اس بات پر کسی کو یقین دلاتا اور بھی مشکل ہے سارے کا سارا مکان کسی ذی روح ہستی کی مانند مجھے اپنی آغوش سے اٹھا کر جبڑوں میں مسل کر آہستہ آہستہ ہضم کرنے لگا۔

شاید اس مکان میں داخل ہونے کے ساتھ ہی اس کا عمل شروع ہو گیا تھا لیکن میں نے جس دن پہلے پہل بیداری کی حالت میں اس کا احساس کیا۔ اس دن کی حالت مجھے اچھی طرح یاد ہے

گرمیوں کے دن تھے بازار سرد تھا۔ اور میرے پاس کوئی خاص کام کاج بھی نہیں تھا۔ آفتاب کے غروب ہونے سے کچھ قبل میں دریا کے گھاٹ کے نیچے کی سیڑھیوں پر آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ دریا ان دنوں کچھ خشک ہو گیا تھا۔ پار کی طرف کا تیلا کنارہ شام کی رنگینی سے پر کشش دکھائی دیتا تھا۔ اس

طرف سیڑھیوں کے نیچے شفاف پانی کی سطح سے پتھروں کے گول اور ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے دکھائی دیتے تھے ہرا نام کو بھی نہیں تھی ۔ قریب کی پہاڑی سے جنگلی پودوں اور پھلوں پھولوں کی خوشبو ذرا اٹھتی اور لپکتی ہوئی کرہ ہوائی عطر بیز کر رہی تھی۔

آفتاب چک پہاڑی کی اوٹ میں رخ روشن کو زیر نقاب کر چکا تھا تو الی النور دن کی عشرتگاہ میں تاریکی اور خاموشی کا تسلط ہونے لگا ۔ یہاں پہاڑوں کی فطری دلکشی سے غروب آفتاب کے وقت روشنی اور تاریکی کا تقابل دیر تک نہیں ہُوا کرتا ۔ گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں جانے کا خیال کر رہا تھا کہ اتنے میں سیڑھیوں سے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی پیچھے مڑ کر دیکھا تو کوئی نہیں تھا کانوں کو غلطی ہوئی یہ خیال کر کے جب میں ذرا بیٹھ گیا ۔ تو یک لخت بہت سے پاؤں کی آہٹ سنائی دی ۔ جیسے کافی تعداد میں نوجوان سکھیاں دوڑتی کودتی پھدکتے ہوئے زمین سے اتر رہی ہیں ۔ تھوڑے خوف کے ساتھ ان کی آمد میں سارے جسم میں کپکپی طاری ہو گئی ۔ اگرچہ میرے سامنے کوئی بھی وجود نہیں تھا ۔ لیکن پھر بھی آنکھوں کے سامنے یہ دکھائی دے رہا تھا ۔ کہ اس گرمی کی شام میں جذبات محبت میں سرشار ماہ آفرینوں کا ایک جھنڈ دریا پر نہانے کو آ رہا ہے ۔ اگرچہ اس شام کے وقت اس بیابان پہاڑ کے کنارے تنہائی میں ہر طرف خاموشی اور سکون کا عالم تھا لیکن اس کے باوجود میں نے سنا ــــــ آبشاروں کی سرمست لہروں کی ٹکر کی طرح قہقہہ زن ہوتی ہوئیں ۔ ایک دوسرے کا تیزی سے پیچھا کرتی ہوئیں اور غسل کے لئے

پیش قدمی دکھاتی ہوئیں شباب کی پتلیاں ٹھیک میری بغل سے گزر گئیں۔ اور کسی نے میری طرف توجہ نہ دی جیسے وہ میرے لئے ناواقف ہیں اور میں بھی ان کا واقف نہیں ہوں۔ دریا پہلے کی طرح ساکن تھا۔ لیکن مجھے ظاہرا طور پر معلوم ہونے لگا۔ کہ وہ ساکن پانی چنچل ہاتھوں کے تھپیڑوں سے تھرا اٹھا ہے ہنسی مخول میں سکھیاں ایک دوسری پر پانی اچھال رہی ہیں اور تیرنے والیوں کے سرمست ہچکولوں سے موتیوں سے لبریز دریا کی روانی سے پانی کی بوندیں ساحل کو شاداب کر رہی ہیں

میرے دل میں ایک قسم کی دھڑکن نمودار ہوئی وہ خوف یا ہیجان کی وجہ سے تھی۔ یا مسرت اور مستی کی وجہ سے ٹھیک نہیں کہا جا سکتا زبردست خواہش ہوئی۔ کہ اچھی طرح کان لگا کر سنے سے ان کی گفتگو صاف طور پر سنائی دے گی معلوم ہونے لگا ——— اڑھائی سو سال قبل کی سیاہ ہستی میرے سامنے کھڑی ہے۔ ڈرتے ڈرتے ذرا ایک کونہ اٹھا کر دیکھے ——— شاید وہاں کوئی بڑی مجلس لگی ہوئی تھی۔ لیکن سیاہ تاریکی میں کچھ دکھائی تو دیتا نہیں تھا۔

اچانک سکوت کو توڑتا ہوا تیز سرسراہٹ سے ہوا کا جھونکا آیا اور ادھر سے بغیر حرکت پانی کو دیکھتے دیکھتے حوران بہشتی کے لام نستعلیق کی مانند دراز بال بکھر گئے شام کی تاریکی سے ڈرتا ہوا سارا جنگل ایک ساعت میں فی الفور آہ و فغاں کرتا ہوا چلا اٹھا۔ خواہ خواب سمجھئے یا بیداری ——— اڑھائی صد پہلے کے واقعات کی تصویر اس سرزمین میں پر رونق ہو کر میرے سامنے پھر سے پیش نظر ہو رہی تھی نا معلوم یہ سب کچھ ایک لمحہ میں کیسے ہو گیا۔ جو جادو نما ماہ آخر

میں میرے بالکل نزدیک ہے —— جسمانیت سے عاری آہستہ آہستہ بے قدم جوش سے قہقہہ زن دوڑتی بھاگتی اور اچھلتی ہوئی دریا کے پانی میں کود پڑی تھی۔ پھر وہ پانی سے اٹھ کر اپنے گیلے کپڑوں کو نچوڑتی ہوئی میرے قریب سے گزریں نہیں۔ ہوا جس طرح خوشبو کو اڑا لے جاتی ہے اسی طرح بہار کے ایک پُر لطف جھونکے میں وہ بھی اڑ کر نامعلوم کہاں چلی گئی ہیں

اس وقت مجھے شبہ لاحق ہوا۔ کہ کہیں اکیلا پاکر سر پر شاعری کا بھوت تو سوار نہیں ہو گیا۔ میں بے چارا رعایا کی چونگی وصول کر کے کسی طرح گزر معاش کرتا ہوں۔ کہیں میرا ستیاناس تو نہیں ہو جائے گا۔ سوچا —— اچھی طرح پیٹ بھر کھانا کھانا چاہیئے۔ خالی پیٹ رہنے سے اس قسم کے تصورات زیادہ تر ذہن پر غالب رہا کرتے ہیں۔ میں نے رسوئیے کو بلا کر گھی سے تر سالن اور مصالحہ سے اٹی ہوئی سبزی تیار کرنے کا حکم دیا۔

دوسرے دن صبح یہ سب واقعات بالکل معلوم ہونے لگے۔ طعام تناول کر کے خوشی خوشی انگریزوں کی طرح ہیٹ کوٹ پہن کر اپنے ہاتھوں ٹمٹم چلاتے ہوئے کام کے لئے چلا گیا۔ اس دن سہ ماہی رپورٹ تیار کرنی تھی اس لیے دیر سے گھر لوٹنا تھا۔ لیکن شام ہوتے ہی ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی مجھے گھر کی طرف کھینچے لئے جا رہا ہے کون کھینچ رہا ہے پتہ نہیں لیکن ایسا احساس ہوا کہ اب دیر کرنا درست نہیں دل سے آواز آئی —— سب منتظر ہوں گی رپورٹ کو نامکمل چھوڑ کر ہیٹ اٹھایا اور فی الفور شام کی سیاہ بخت تاریکی سے معمور بیابان کو ٹمٹم کی آواز سے متحرک کرتا ہوا اپنے پُرسکون محل کی طرف چل دیا

سیڑھیوں کے اوپر والا سامنے کا دیوان خانہ کافی بڑا تھا۔ اس میں بلند و بالا بڑے بڑے دروازوں کی تین قطاریں تھیں۔ محراب پر سنہری گلکاری کا میناکاری کا ... تھا۔ وہ بڑا کمرہ اپنی کشادگی لیکن بے رونقی سے ہر وقت خوفناک دکھائی دیتا تھا۔ اس دن شام کی وجہ سے بھی لیمپ نہیں جلائی گئی تھی دروازہ کھول کر میں جونہی کمرہ میں داخل ہوا۔ تو معلوم ہوا کہ وہاں ایک زبردست شور بلند ہے اور ایسا دکھائی دیتا ہے۔ کہ مجلس درہم برہم ہو رہی ہے کہ چاروں طرف سے کھڑکیوں دروازوں اور جھروکوں کی راہ ہر ایک بھاگ رہا ہے اور تھوڑی دیر میں وہ کمرہ بالکل سونا ہو گیا۔ اور میں اس کی حالت کو دیکھ کر دنگ رہ گیا میرا روم روم کھڑا ہو گیا۔ کافی عرصے کے بعد آج پھر مجھے خوشبویات کی لپٹیں محسوس ہونے لگیں۔ جو میں اس بے چراغ کمرہ کے پرانے ستونوں سے کھڑا ہوا سن رہا تھا۔ جھر جھر کرتا ہوا فوارہ کا سفید پانی سنگِ مرمر پر گر رہا تھا۔ ساز بج رہے ہیں اور سازندے گا رہے ہیں۔ لیکن میں اس راگ کو سمجھ نہیں سکتا تھا کسی طرف طلائی زیورات کی جھنکار کہیں ناچنے والوں کی چھم چھم اور کہیں گھڑیال کی کرخت آواز کافی دور سے نقارے کی چوٹ اور نوبت بجنے کی صدا، ہوا میں جھومتی ہوئی ٹہنیوں اور پتوں کی سرسراہٹ برآمدے سے باہر بلبلوں کی راگنی باغیچہ سے پالتو سارسوں کی سوں سوں ——— سب نے مل کر جیسے مجھے ہر پہلو سے مسحور کر رکھا تھا۔

مجھے ایک قسم کا محبت کا احساس ہونے لگا اور معلوم ہوا ——— کہ دنیا کا یہ غیر معلوم واقعہ درحقیقت بعید از قیاس نہیں اور باقی جو کچھ بھی محسوس کر

رہا ہوں شراب سے زیادہ نہیں میں اپنے آپ کو بھول گیا ـــــــ کہ میں کون ہوں کس کا بیٹا ہوں۔ اور ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار کا چونگی کا کلکٹر ہوں دیدہ زیب لباس میں ملبوس ہو کر ٹم ٹم چلاتا ہوا روزانہ دفتر جاتا ہوں ـــــــ یہ سب کچھ میرے لئے محض جھوٹ اور بے سرو پیر کی باتیں معلوم ہونے لگیں۔ میں اس وسیع تاریکی سے لبریز مجلس میں زور سے قہقہہ زن ہوا۔

اتنے میں میرا مسلمان چپڑاسی ہاتھ میں لالٹین لئے ہوئے گھر میں داخل ہوا اس نے مجھے پاگل خیال کیا یا نہیں میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اس وقت مجھے خیال آیا کہ میں فلاں باپ کا بیٹا ہوں۔ اور یہ بھی سوچنے لگا۔ کہ دنیا میں کہیں نہ کہیں غیر معلوم فوارہ ہمیشہ جھرتا ہے یا نہیں۔ اور غیر محسوس انگلیوں کی ضرب سے کوئی مضراب بجا کر گیت گاتا ہے۔ یا نہیں اس حقیقت سے ہمارے شعرا ہی واقف ہو سکتے ہیں۔ جو غیر محسوس تخیل کو بھی الفاظ کے قالب میں بند کر کے سحر طرازی کرتے ہیں۔ لیکن یہ تو یقیناً درست ہے کہ میں بھیڑ دیہہ کی چونگی میں تنخواہ دار ملازم ہوں۔ یہ خیال کر کے میں نے ماضی کے واقعات کا جائزہ کرنا شروع کیا۔ میز کے قریب لیمپ کے سامنے اخبار دیکھ دیکھ کر مزے سے مسکرانے لگا۔

اخبار پڑھ کر اور طعام تناول کر کے کونے والے چھوٹے سے کمرہ میں بتی گل کر کے بستر پر دراز ہو گیا۔ سامنے کھلی ہوئی کھڑکی سے تاریکی میں پہاڑ کی بلندی پر آسمان کی لاکھوں میل کی مسافت پر ایک ستارہ چمکتا ہوا

دکھائی دے رہا تھا۔ اور اس کی دھیمی دھیمی روشنی چارپائی پر دراز دروغہ چونگی پر نظر بازی کر رہی تھی۔ میں اس کی روشنی تیز چمک سے حیرت زدہ کس وقت سو گیا۔ مجھے پتہ نہیں۔ کتنی دیر تک سوتا رہا۔ یہ بھی نہیں جانتا۔ یکا یک میں چونک کر بیدار ہو گیا۔ کمرہ میں سے آہٹ سنائی دی اور ایسا خیال آ رہا تھا۔ کہ کوئی ابھی اندر داخل ہوا ہے۔ ایسا نہیں تھا۔ سیاہ پہاڑ کی بلندی پر جو ستارہ چمک رہا تھا۔ وہ گم ہو گیا۔ اور ایاب دو دھاب کے تھپیڑے کھاتا ہوا چاند پچھلی رات میں اپنی روشنی کی پٹیں میری چارپائی پر پھینک رہا تھا۔

کمرہ میں کوئی آدمی مجھے دکھائی نہ دیا۔ لیکن اس کے باوجود مجھے محسوس ہوا کہ کوئی آ کر اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے آہستہ آہستہ جھنجھوڑ رہا ہے میں بیدار ہو کر اٹھ بیٹھا۔ تو دیکھا کہ منہ سے وہ کچھ نہ کہتے ہوئے صرف اپنی انگشتریوں سے پُر رونق انگلیوں سے اشارہ کر کے نہایت احتیاط سے اپنے پیچھے آنے کا کوئی باہوش اشارہ کر رہی ہے

میں کافی حد تک آہستگی سے اٹھا۔ اگرچہ اس مکان میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ پھر بھی قدم قدم پر دہشت نظر آتی تھی۔ کہ کہیں کوئی میرے پاؤں کی آہٹ سے بیدار نہ ہو جائے۔ اس محل کے کمرے عموماً بند رہا کرتے تھے اور ان کمروں میں میرا کبھی گزر بھی نہیں ہوا تھا۔

اس رات کو اندھیرے میں آہستہ آہستہ پاؤں رکھتا ہوا اپنے سانس کو روکے ہوئے اس غیر معلوم دوشیزہ کے پیچھے پیچھے میں کہاں جا رہا تھا۔ آج تک میں اسے اچھی طرح نہیں سمجھ سکا۔ کتنا خوفناک پُر ہول راستہ کتنے

لمبے چوڑے برآمدے کتنے وسیع اور کشادہ دیوان خانے سے کتنی چھوٹی چھوٹی بند کوٹھڑیوں پاٹتا ہوا گزر رہا تھا۔ اس کا کوئی اندازہ نہیں ہے

اپنی اس خیالی حسینہ کو اگرچہ میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا لیکن پھر بھی اس کی شکل و صورت میرے دل سے محو نہیں تھی۔ وہ ایرانی دوشیزہ تھی۔ ڈھیلی آستینوں میں چھپے ہوئے سنگ مرمر کی طرح سفید گول گول ہاتھ دکھائی دے رہے تھے۔ سر پر پیشانی سے اوپر زر دوزی کا فیتہ اس کی نازک ترین گلابی چہرہ پر جالی دار کپڑے کی ایک نقاب پڑی ہوئی تھی اور بغل میں ایک بانکی تلوار لٹک رہی تھی۔

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے الف لیلیٰ کی ہزار راتوں میں سے کوئی ایک رات آج افسانوی دنیا سے یہاں اڑ کر آ گئی ہے جیسے میں اندھیری دنیا میں خوابیدہ بغداد کی تاریک گلیوں میں پُر ہول مصیبت کے لئے سفر کر رہا ہوں

آخر کار میری رفیقہ ایک گاڑھے نیلے رنگ کے پردے کے سامنے جا کر اچانک ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ اور نیچے کی طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے کچھ دکھانے لگی۔ نیچے بھی کچھ نہیں تھا۔ پھر بھی میرے جگر کا خون جم کر یخ بستہ ہو گیا۔ مجھے صاف معلوم ہونے لگا۔ اس پردے کے سامنے زمین پر کمخواب کی پوشاک زیب تن کئے ہوئے ایک ہیبت ناک حبشی خواجہ سرا ننگی تلوار لئے دونوں پاؤں پھیلائے بیٹھا اونگھ رہا ہے راہ یار نہ نہایت نرم رفتاری سے اس کے پاؤں کو پاٹ کر پردے کے پاس پہنچی اور آہستگی سے اس نے پردے کا ایک کونہ اٹھایا۔

تھوڑا سا اندرونی حصہ دکھائی دیا دیکھا کہ خاص فارس کا بنا ہوا بڑھیا غالیچہ بچھا ہوا ہے۔ تخت کے اوپر کون بیٹھا ہے یہ معلوم نہ ہوا صرف کیسری رنگ کا ڈھیلا پاجامہ اور زریدار جوتے چھوٹے چھوٹے خوبصورت پاؤں میں گلابی مخملی کرسی پر لاپرواہی سے بیٹھی ہوئی کوئی وجود ہی موجود تھی۔ فرش پر ایک سمرت ایک نیلے برتن میں سیب، ناشپاتیاں، نارنگیاں، اور انگوروں کے گچھے آویزاں تھے۔ اس کے قریب ہی ایک چھوٹا سا پیالہ اور سنہری شراب سے لبریز بلوریں صراحیاں کسی مہمان کی منتظر تھیں۔ اور اندر سے ایک قسم کا خوشبودار دھواں اپنی مستانہ لپٹوں سے مجھے بے سدھ کرنے لگا۔

میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے جونہی اس خواجہ سرا کی ٹانگوں سے گزرنے کی جسارت کی وہ چونک کر بیدار ہو اٹھا۔ اس کی گود میں موجودہ ننگی تلوار جھنجھناتی ہوئی مرمریں فرش پر گر پڑی

اچانک ایک مہیب ناک چیخ سن کر میں بھی چونک پڑا۔ آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ اپنی چارپائی پر لیٹا ہوا پسینہ سے شرابور ہو رہا ہوں۔ صبح صادق کی روشنی سے چاند کی شعاعیں مدھم پڑ رہی تھیں۔ اور اپنا پاگل مہر علی اپنی فطری عادت کے مطابق آفتاب کی روشنی کے نمودار ہونے سے کچھ قبل ہی سنسان سڑک پر دور رہو، دور رہو۔ سب جھوٹا ہے سب جھوٹا ہے چلاتا ہوا نکل گیا۔

ہاں اس طرح الف لیلہ کی افسانوی شب کے تاریک رخ سے پردہ ہٹ

گیا مگر ابھی ایک ہزار راتیں باقی تھیں

میرے دن کے سارا اوقات کی کشمکش جاری تھیں دن کو کام کاج میں مصروف رہا کرتا تھا۔ اور تاریک سنسان رات کے وقت دن کے کام کاج پر نادم ہوا کرتا۔ اور پھر شام کے ہوتے ہی اپنے روزانہ کے معمول کی طرح ہر ایک کام کو غلط انداز طور پر مذاق خیال کرنے لگ جاتا ہے

شام کے بعد میں ایک الوٹ نشہ میں اسیر اپنے آپ سے الجھ رہا تھا اور سیکڑوں سال قبل کے غیر مطبوعہ واقعات کو دیکھنے والا ایک عجیب انسان بن جاتا۔ اس وقت میں سر پہ سرخ مخملی ٹوپی ڈھیلا پاجامہ بھدا لمبا قیمتی لمبا ریشمی چوغا پہن کر رنگین رومال میں عطر سینچ کر بڑی دلچسپی سے اپنے آپ کو تیار کرتا۔ اور سگریٹ پھینک کر لمبی سنہری نال والا اور گلاب کے عرق سے لبریز حقہ خوان سے کر اونچی گدی دار مسند پر لیے اندازے بیٹھ جاتا جیسے کوئی محبوب اپنے عاشق کی پرکشش انتظار میں نہایت کوشش سے تیار بیٹھا ہے۔

اس کے بعد تاریخی حقیقتیں بھی خوفناک ہوتی اتنی ہی تعجب نما کیفیتیں رونما ہوتیں۔ جس کا ذکر بیان سے باہر ہے درحقیقت اسی طرح جیسے کوئی عجیب و غریب کہانی کے پریشان ٹکڑے بہار کا پرسرور دھیمی ہوا سے اس محل کے دلکش کمروں میں اڑ رہے ہوں۔ کہانی کے اوراق کا کچھ حصہ تو مل رہا ہو لیکن کچھ ورق باوجود تجسس کے نہ ملتے ہوں میں بھی ان اڑتے ہوئے صفحات کے پیچھے دوڑتا ہوا ساری رات کمرے کمرے اور کو ٹھڑی

کوٹھڑی میں مارا مارا پھرتا رہا

اس مسلسل خواب کے جھمیلا میں کبھی حنا کی خوشبو کبھی استار کی جھنکار اور کبھی آبشار کی آواز میں پلی ہوئی ہوا کی لہریں اپنی ہستی کے جہاز کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد برق پاشی کرتی ہوئی دیکھا کرتا۔ میرا انسانی روح کو محبت کی زنجیر کا اسیر کرنے والا کیسری رنگ کا پاجامہ پہنے اپنے نیم گلابی نازک پاؤں میں زربدار نوکیلی جوتیاں پہنے ہوئے اپنے دلدوز لباس پر زری کی گلکاری۔ کنڈل دار، پیچ در پیچ بال اور سر پر سندوری رنگ کی شاندار ٹوپی پہنے جس کے سامنے سنہری لٹکتی ہوئی جھالر بار بار اس کے ارغوانی رخساروں پر بوسہ بازی میں مصروف تھی۔ اس خوفناک تاریکی میں برق آسا استہزا نمودار ہوتا تھا۔

اس نے مجھے ہوش و حواس سے عاری کر دیا تھا۔ اسی سلسلہ میں روزانہ نیند کی حکومت میں خواب کی مشکل ترین راستہ کی الجھن سے جادو کے قلعہ کی گلی گلی اور کوٹھڑی کوٹھڑی میں ادھر ادھر بھٹکتا پھرتا ہوں۔

کبھی کبھی روزانہ شام کو جب میں بڑے آئینے کی دونوں طرف بتیاں جلا کر بڑی دلچسپی کے ساتھ اپنے آپ کو شہزادے کے لباس میں سجاوٹ میں مشغول رہتا تو اچانک دیکھتا۔ کہ آئینہ میں میرے عکس کے از حد قریب تھوڑی دیر کے لئے اس ایرانی ماہ پارہ کا عکس آ موجود ہوتا جو اپنی صراحی دار گردن ہلا کر بڑی ہوئی سیاہ آنکھوں کی پتلیوں سے متانت اور تقاضہ کے ساتھ ترچھی چتوں سے اشارے کرتی ہوئی انداز خاص سے مٹکتی ہوئی شباب کی مستی سے لبریز وجود

کو تیزی سے ابھراتی ہوئی تمسخرانہ اشاروں سے نظر بازی کی چنگاریوں کو برساتی ہوئی آئینہ میں ہی جذب ہو جاتی۔ پھر پہاڑ کی خوشبودار ہوا کے جھونکے آتے اور میری دونوں شمعوں کو گل کر دیتے میں بھی اپنی تمام مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر زینت افروز مکان کے ایک کونے میں پڑی ہوئی چارپائی پر لیٹ جاتا میرا جسم جنبش زن ہو جاتا۔ تاہم میں سونے کی کوشش کرتا۔ اس وقت میرے چاروں طرف ہوا کے جھونکے پہاڑ کی عطر بیز لپٹوں کو پھیلاتے اور محبت کی سحر طرازی دم زدن میں بوسہ کناں ہوتی ہوئی۔ اور آسمان سے طرح طرح کی آوازیں سنائی دیتیں میرے رخساروں پر سیاہ لمبے بال آآ کر بکھر جاتے اور بار بار کسی نزاکت آفرین محبوبہ کا باریک دوپٹہ آکر میرے لبوں پر گرتا اس سرسراہٹ سے بے چین سا ہو جاتا۔ آہستگی سے یہ دلکش اژدر اپنے مستانہ انداز سے میرے بند بند کو جکڑ لیتا۔ اور میں خراٹے بھرتا ہوا مدہوش ہو کر دریا میں سونے کو چل دیتا۔

ایک روز شام سے قبل ہی گھوڑے پر سوار ہو کر ہوا خوری کے لئے کہیں چلے جانے کا میں نے ارادہ کر لیا۔ معلوم نہیں پچھلی طرف سے کون مجھے منع کر رہا تھا۔ لیکن پھر بھی میں نے اس کی ایک نہ مانی ایک کھونٹی پر میرا ہیٹ اور کوٹ لٹک رہا تھا میں نے انہیں جونہی پہننا شروع کیا۔ اس دریا کی بہت دور پہاڑ کے خشک پتوں کا پھریرا اڑاتا ہوا ایک زور کا بگولا یکایک اٹھا اور میرے کوٹ پینٹ ہیٹ کو چھین کر نا معلوم کہاں اڑا کر لے گیا۔ اور ساتھ ہی ایک دلکش ہنسی کی آواز اس طوفانی بگولے کے ساتھ زیر نقاب بلند تر ہو کر

آفتاب کے قریب پہنچ کر غائب ہو گئی۔

اس روز پھر میرا گھوڑے پر سوار ہونے کا موقعہ نہ مل سکا اور اس کے دوسرے روز میں نے انگریزی لباس کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ دیا۔

ایک دن پھر میں خواب کی حالت میں اٹھ کر بیٹھ گیا سننے میں آیا کہ جیسے کوئی آہ و بکا کرتا ہوا نالہ زن ہے جیسے میری چارپائی کے نیچے زمین کے اندر سے اس محل کی بڑی بڑی بنیادوں کے نیچے کسی قبر سے کوئی روتے ہوئے کہہ رہی ہو ـــ تم مجھے اس تنگنائی میں خوابیدگی کے تمام ذرائع مفقود کرکے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی بغل میں دبا کر جنگل سے پہاڑیوں کو پاٹ کر دریا کو عبور کرکے اپنی آفتابی دنیا میں لے چلو اور مجھے مخلصی دلاؤ۔

میں کون ہوں کیسے میں تمہیں مخلصی دلاؤں اس مسلسل خواب میں ڈوبتے ہوئے خیالی بھنور میں تخیلات کی بھنور کو ساحل تک پہنچاؤں۔ کب تھیں۔ کہاں تھیں اے عجوبہ! تم کسی خنک آبشار میں کھجوروں کے جھنڈ کے سائے میں کسی بے گھر اور بے در محبوبہ کی تلاش میں نمودار ہوئی۔ تمہیں کونسا ڈاکو، بدو اور جنگلی بیل سے کود کر تیز رفتار گھوڑے پر سوار کرکے جلتے ہوئے ریگستان کو پار کرتا ہوا کسی شہزادی کے لیے فروخت کرنے کیسے گیا تھا وہاں کس بادشاہ کا کونسا خیر خواہ خدمت گار تمہاری تازہ ابھان کی شباب اور شادابی کو دیکھ کر سونے کی مہروں کے بدلے میں خریدے گا سمندر پار ہو گیا سونے کی پالکی میں بٹھا کر تمہیں اپنے آقا کے شہر میں عقیدت سے ہدیۃً پیش کیا گیا تھا۔ وہاں وہ کونسی کہانی تھی۔ اسکی سارنگی کے گیت ساز ندگی

جھنکار جھلکتی ہوئی شیرازی، شراب کی سنہری صراحیوں سے آبخوروں میں انڈیلی ہوئی مے ناب، از ہر کے بجھے ہوئے نشتر اور اشاروں کی ستم کاری اف! کیسی حیران کن، کیسی عجیب اور کیسی تعجب خیز حالت دونوں طرف باندیاں اپنی طلائی چوڑیوں کے نگینوں کو جھلملاتی ہوئی چنور ہلا رہی ہیں۔ شہنشاہ بادشاہ ان کے نازک آفرین پاؤں پر ——— موتیوں سے جڑی ہوئی جوتیوں کے قریب ——— لوٹ رہے ہیں۔ اور باہر کے دروازہ پر فرشتہ موت کی صورت بنائے ہوئے حبشی پیغمبروں کی پوشاک پہنے ہوئے ہاتھ میں ننگی تلوار لیکر کھڑے ہیں اس کے بعد کتنے نوجوانوں کا خون خشک کرنے والی ہزاروں امنگوں اور ارمانوں کو مسل کر پھینکتی ہوئی محبوبہ کس عالم میں پہنچائی گئی ہو

اتنے میں پھر پاگل مہر علی کی کانوں کو پھاڑنے والی آواز کانوں میں آئی دور رہو، دور رہو سب جھوٹ ہے جھوٹ ہے" آنکھیں کھول کر دیکھا ——— دن چڑھ آیا ہے جبیر اسی نے ڈاک لاکر میرے ہاتھوں میں دی اور باورچی آکر دریافت کرنے لگا ——— آج کونسا کھانا بنایا جائے"

میں نے کہا۔ بس اب اس مکان میں رہائش نہیں ہو سکتی اسی دن میرا سارا اسباب دفتر چلا گیا۔ دفتر کا بوڑھا کلرک کریم خاں مجھے دیکھ کر ذرا مسکرایا میں اس کی اس حرکت سے ناراض سا ہو گیا۔ اور بغیر جواب دیئے اپنا کام کرتا رہا

جوں جوں شام قریب آتی تھی میں حیران ہونے لگ گیا ——— معلوم ہو رہا تھا کہ ابھی کہیں جانا ہے ——— روئی کے حساب کی پڑتال مجھے از حد غیر ضروری معلوم ہوئی اور نظام کی نظامت کی قدر و عظمت کا احساس بھی نہ

رہا ہے ـــ جو کچھ موجود ہے اور میرے ارد گرد جو کچھ ہو رہا ہے سب کا سب بے معنی اور غیر ضروری معلوم ہونے لگا۔

میں قلم پھینک کر بھاری بھر کم کھاتے بند کر کے فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور ٹمٹم پر بیٹھ کر چل پڑا اور دیکھا کہ غروب آفتاب سے قبل میں اس محل کے دروازے پر پہنچ گیا ہوں چنانچہ جلدی سے سیڑھیوں سے گزرتا ہوا اندر پہنچا۔

آج ہر سمت سکون ہے محل کی سب کی سب کوٹھڑیاں جیسے مجھ سے سخت ناراض ہیں۔ غصہ اور پشیمانی سے میں دل باہر آنے کو تھا مگر کس سے کہوں کس سے دست بستہ ہو کر معذرت خواہی کروں کوئی ہو تو سہی میں بیدل سا ہو کر اندھیری کوٹھڑیوں میں پھرنے لگا۔ جی چاہنے لگا۔ ایک ستار ہاتھ میں لے کر کسی کو سنانے کے لئے کچھ گاؤں اور کہوں کہ اے محبوبہ! جو پتنگ تمہیں چھوڑ کر بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ پھر قربان ہونے کو آیا ہے اب کی بار اُسے معاف کر دو اس کے دونوں بازو جلا دو اور بھسم کر دو۔

یکایک اوپر سے میرے گالوں پر آنسو کی دو بوندیں پڑیں اس روز پہاڑ پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں تاریک جنگل پر شفاف نیلگوں پانی کے بادل برسنے کو تیار تھے۔ اچانک بجلی کی تڑپ نمودار ہوئی۔ اور ایک پرزور طوفان زنجیر توڑ کر بھاگتے ہوئے مست ہاتھی کی طرح شور بلند کرتا ہوا چلا گیا۔ اور ساری عمارت کے دروازے کھڑکیاں اور کواڑ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

آج نوکر چاکر اور دفتر والے سب مکان پر ہی تھے وہاں بتی جلانے والا بھی کوئی نہ تھا۔ شب دیجور میں محل کے اندر کے سیاہی مائل اندھیرے میں بالکل

ٹھیک طور پر محسوس کرنے لگا کہ ایک گل پاش حسن پلنگ کے لئے غالیچے پر اوندھی پڑی ہوئی اپنی دونوں مٹھیاں باندھ باندھ کر اپنے بکھرے ہوئے پریشان بالوں کو نوچ نوچ کر پھینک رہی ہیں کبھی وہ خشک انداز میں بنہیں دیتی ہے اور کبھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ جاتی ہے کبھی گریباں چاک کرتی ہوئی چھاتی پیٹ لیتی ہے ——— اور کھلی ہوئی کھڑکیوں سے گرجتی ہوئی طوفانی ہوا اور موسلادھار بارش کی بوچھاڑ آ آ کر اس کے خوبصورت جسم کو نم آلود کرتی ہے

ساری رات نہ تو آندھی تھمی۔ اور نہ ہی رونا بند ہوا۔ میں بلا دجہ پیچ و تاب میں تاریک کوٹھڑیوں میں بھٹکتا رہا۔ کسی کسی کا پتہ نہ چلا تسلی دوں تو کیسے؟ پُر غرور خوش کیسا ہے؟ اور یہ دلی غم اور اضطراب کہاں سے اٹھتا ہے۔

پاگل مہر علی چلا اٹھا۔ "دور ہو دور ہو سب جھوٹ ہے سب جھوٹ ہے"

میں نے دیکھا تو علے الصباح ہی اور مہر علی اس پُر طوفان میں بھی روزانہ کے معمول کی طرح اس محل کے اردگرد پھرتا ہوا اپنی عادت پوری کر رہا تھا فی الفور خیال آیا ——— شاید یہ مہر علی بھی میری ہی طرح کسی وقت بدبختی کا شکار اس محل میں ٹھیرا ہوگا۔ اور اب ہوا س باختہ ہو کر باہر نکل بھاگنے پر بھی اس پتھریلے بھوت کی محبت سے متحرک ہو کر روزانہ سویرے اس کے اردگرد پھرتا رہتا ہے۔

میں اسی وقت صبح صادق کے اندھیرے میں دوڑ کر اس پاگل کے پاس گیا اس سے پوچھا مہر علی جھوٹ کیا ہے؟

میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیکر زور کے دھکا سے مجھے گرا کر اڑ رہا

کی طرح پھنکارتا ہوا محبت میں اسیر پرندے کی طرح چلاتا ہوا وہ مکان کے ارد گرد پھرنے لگا۔ اور ہوشیاری سے بار بار چلانے لگا "دور رہو، دور رہو سب جھوٹ ہے سب جھوٹ ہے"

میں اس طوفانی حالت میں گھبرایا ہوا دفتر پہنچا۔ اور کریم خاں کو قریب بلا کر دریافت کیا۔ "اس کے معنی کیا ہیں مجھے صاف صاف بتاؤ؟" بوڑھے نے جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ کسی وقت اس محل میں دنیا کی عیش و عشرت کے بے شمار ساماں موجود تھے۔ ان سب دلکشی کے لوازمات سے اس محل کا ذرا ذرا معمور ہے زندہ انسان اسے دیکھ کر بے قابو ہو جاتا ہے آج تک جو شخص بھی یہاں تین راتیں رہا ہے ان میں سے مہر علی ہی پاگل ہو کر نکلا آج تک کوئی اس کے واسطے بچ نہ سکا۔

میں نے پوچھا "میری مخلصی بھی کسی طرح ہو سکتی ہے؟"

بوڑھے نے کہا "صرف ایک ہی ترکیب ہے جو کہ بہت ہی مشکل ہے وہ تمہیں بتاتا ہوں مگر اس سے پہلے اس گلشن کی ایک ایرانی مجوبہ کی کہانی ضروری ہے ایسی عجیب اور دل ہلانے والا واقعہ شاید دنیا میں کبھی ہوا ہو

اتنے میں قلیوں نے آکر خبر دی۔ گاڑی آرہی ہے حضور!

اتنی جلدی، فی الفور لبتر باندھتے ہی گاڑی آگئی۔ اس گاڑی کے فسٹ کلاس کمپارٹمنٹ سے اسی وقت سوتے سے اٹھا ہوا ایک انگریز کھڑکی سے گردن نکال کر اسٹیشن کا نام پوچھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمارے رفیق سفر

کو دیکھتے ہی وہ "ہیلو" کہہ کر چلا اٹھا اور انہیں اپنے ڈبہ میں بلا لیا۔ ہم سب ایک سیکنڈ کلاس ڈبے میں سوار ہو گئے۔ پھر اس بابو صاحب کا کچھ پتہ نہ چلا کہانی کا آخری حصہ بھی نہ سن سکے۔

میں نے کہا ——— دیکھو حضرت! ہم لوگوں کو بیوقوف بنا کر کیسا چکما دے گیا۔ شروع سے آخر تک بناوٹی کہانی ہے۔

اسی وجہ سے اپنے نیتا سوفسٹ دوست سے زندگی بھر کے لئے میرا تعلق ٹوٹ گیا

تکرارِ محبت

رضیہ کا دربار

(۱)

"آج کل تو معین بھیا کے گھر کی خانہ جنگی کی وجہ سے محلہ بھر کی نیند حرام ہو رہی ہے"

رضیہ کے آنگن میں ہمسایہ کی بڑی بے نصیبن نے دوپہر کے سناٹا میں اتنا کہا تو سامنے بیٹھی ہوئی چرخہ چلاتی مجید کی ماں فاطمہ بول اٹھی ــــ ارے ان کی بات نہ کہو نصیبن! ایسی عقلمند بہو حاصل کر کے بھی رات دن لٹھ لئے سر پہ سوار رہتی ہے۔ ظالم ہے ظالم۔ فریبی ہے ہمارا گھرانہ چوپٹ کر دے گی ارے اس کا رونا کس کس سے کہوں بھائی محلہ بھر کا ناک میں دم کر رکھا ہے!"

قریب ہی بیٹھی ہوئی بشمشاد کہنے لگی ــــ ارے نصیبن کی بات تو سنو وہ جب گرجنے لگتی ہے۔ تو زمین و آسمان لرز جاتے ہیں جب دیکھو ایک نہ ایک لڑائی لڑ رہی ہے۔ آنت ڈھاتی ہے بہو کی حالت دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے جو جاتی ہے۔ اس کی مظلومیت پر چند آنسو بہاتی ہوئی آتی ہے "

ایک طرف برتن صاف کرتی ہوئی کریمن ہاتھوں کو میلی کچیلی ساڑھی کے آنچل سے صاف کرتی ہوئی اپنے رخساروں سے سر کا کرتا پیچھے پھینکتی ہوئی بول اٹھی۔

اے باپ رے باپ! بہو تو بھلا پرائے گھر کی بیٹی ٹھیری تو وہ حسد سے اس قدر سیخ پا ہوتی ہے کہ اپنے پیٹ کی اولاد بیٹے کو ہر معاملہ میں دغتا بنانے کو تیار ہے۔ یہ بیٹا ہے جو یہ حالت دیکھ کر حیران ہے اور وہ ہے جو بیٹے کو دیکھ کر خوش ہونے کی بجائے الٹا کوستی ہے ——— اور کہتی ہے جورو کا غلام ہو گیا ہے۔ بازاری عورت کے ہتھے چڑھ کر بھڑوا بن گیا ہے۔ نامعلوم وہ دنیا میں اکیلا اس قماش کا آدمی ہے جب سے ان کے گھر میں نئی بہو آئی ہے۔ لڑائی جاری ہے۔ شاید اور کسی کے گھر جیسے ساس اور بہو کبھی آئی ہی نہیں

دالان میں پاپڑ بیلتی ہوئی رحمت سے بھلا کیسے صبر ہو سکتا تھا وہ اپنے ادھ بیلے پاپڑ سے بیلنا اٹھا کر بولی ——— اے بہن! یہاں تو گھر گھر خانہ جنگی ہو رہی ہے۔ کب بیاہ ہو۔ کب بہو آئے۔ کب گھرا یاد ہو۔ کب خوشی اور مسرت دکھائی دے پہلے تو اسی قسم کے خیالات ہوا کرتے ہیں جب بہو گھر آئی ساس بہو میں ٹھن گئی۔ پھر تو ہر وقت لٹھم لٹھا اور جب سے رہا بھتا ہے یہی گھر گھر دیکھنے میں آتا ہے،

رحمت کی بات پر نصیبن ہاتھ ہلا کر منہ بنا کر آنکھیں پھاڑ کر رعب سے کہنے لگی ——— اری تم کیسی بات کہتی ہو رحمت! سب کے گھر میں لڑائی

رہتی ہے جس گھر میں ساس بہو ہوگی وہاں اس قسم کا بلہ تو عام طور پر ضرور دیکھنے میں آے گا ہی ـــــ

نصیبن کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ کہ پہلے ہی شمشاد نے درمیان میں اپنے جبڑے کھولے اور لگی ملاؤں کی طرح سب کو متوجہ کر کے وعظ کرنے ـــــ اب سنو تو! تمہاری باتیں سن سن کر جی اچاٹ ہو گیا ہے مجبوراً کہنا پڑ رہا ہے۔ اصل بات ہم سے سن لو۔ ہمارے ہاں کہا کہتے ہیں ، جب بہو گھر میں آتی ہے۔ تو آتے ہی شوہر کو قابو میں کر لیتی ہے اور جب دولہا دلہن کا بن جاتا ہے۔ تو بس ماں کو ہاتھ دھونے پڑتے ہیں ماں کو تسلی کون دے۔ وہ تو زندگی کے پالے پوسے بیٹے کو قبضہ اقتدار سے باہر ہوتے دیکھ کر بد حواس ہو جاتی ہے۔ مناسب اور غیر مناسب کا احساس نہیں رہتا ماں پر تو ایک قسم کی بیہوشی ہی رہتی ہے یہی سمجھنا چاہیے "

شمشاد کا ہاتھ پکڑ کر نصیبن نے کہا ـــــ یہ تم اپنی مروت رہنے دو یہ کرۂ دنیا میں ساس بہو تھوڑے ہیں۔ تمہارے سامنے میرے بال سفید ہو گئے کسی نے کبھی لڑائی جھگڑے کا ذکر بھی سنا ہے۔

ایسا اگر سب کے گھر میں ہوتا تو کسی کو گلہ کرنے کی احتیاج بھی کیا تھی۔ بہو تو کہتی ہے کہ میری ساس کچھ عجیب سی زبان دراز واقع ہوئی ہے وہ خود کبھی کبھی کہتی ہے کہ میں بھی اپنی ساس کے ہاتھوں لاچار تھی۔ کیا کروں شاید اسی کا بدلہ مل رہا ہے۔

اب جب شمشاد نصیبن کی باتوں سے لاجواب ہو گئی۔ تو منہ پھیر کر بولی "اے کون! منہ پھوٹ کہتی ہے اس کی ساس کو میں کب سے جانتی ہوں۔ اس دیوی پر بہو مونث کا اتہام تراشتی ہے وہ بھی اس کا بدلہ ضرور پائے گی۔ وہ جو ملک عدم کو چلے گئے۔ بات بات میں ان پر گالی گلوچ کی بھاڑ سب سے بڑا گناہ ہے ایک تو لڑائی جھگڑا کرتی ہے اور پھر ساس پر بے بنیاد الزام تراشتی ہے ان سب کا بدلہ خدا کی بارگاہ سے ہی اسے ملے گا۔

اس وقت بہو ہاتھ میں پیتل کا لوٹا لئے گلے میں پھولوں کی مالا پہنے کندھے پر دوپٹہ لٹکائے مٹکتی ہوئی آنگن میں آداخل ہوئی۔

اب تو سب نے چپ سادھ لی۔ کریمن سر نیچے کئے برتن صاف کر رہی ہے فاطمہ اپنے چرخہ کی آواز میں محو تھی۔ اور رحمت پاپڑ بیلتی ہوئی نامعلوم کن خیالات میں مستغرق تھی۔ سب کے سینہ پر سانپ لوٹ گیا اور آن واحد میں ایسا سناٹا چھایا۔ جیسے یہاں کوئی ہے ہی نہیں خاموشی کا عالم تھا جیسے بہو کے وہاں پہنچتے ہی بادل کے بغیر بجلی کڑک گئی۔

اس موقعہ پر بھی صرف آنگن کی مالک رضیہ کو ہی حوصلہ ہوا اور وہ بولی "بہن! کہاں جا رہی ہو۔ گھر سے کوئی چٹھی تیری آئی ہے گھر میں خیریت تو ہے؟"

چٹھی وغیرہ کی کیا کہتے ہو! بہن میں نے خط کر بلایا بھائی نے کئی پیغام بھیجے۔ جانے کو تو میں چلی ہی جاؤں بچی میں کئی بار آئی۔ سوچتی ہوں۔

جاؤں یا نہ جاؤں ۔ سکے کہ بہو ہوا کی سرسراہٹ میں آنچل اڑاتی تتلی کی طرح تھرکتی ہوئی یہ جا وہ جا!

تعارف

احمد پور کی رضیہ کو وہاں بچے بوڑھے سب جانتے تھے اس کے آنگن میں وہ زنانہ کھانے پکانے سے فارغ ہو کر محلہ بھر کی عورتیں اپنے لڑائی ، جھگڑوں کا فیصلہ کرانے آیا کرتی تھیں ۔ جس دن کو داد رسی کو نہ آتی تھی ، اس دن سب بیٹھ کر اپنے اپنے گھروں کے حالات سناتیں اور تعریف کے پل باندھتیں ۔ رضیہ گھر میں اکیلی تھی ۔ اس کا خاوند اس پر رحمت کیے نکلے کا لام تھا اس لئے گھر میں کھانے کو روٹیاں آ جایا کرتی تھیں اور اسے ہی رضیہ اپنی زندگی کا اثاثہ خیال کرتی تھی ۔

رضیہ کو پیٹ پلنے کا کوئی فکر نہیں تھا ۔ اس لئے اس کا آنگن گلستاں کی طرح ہر وقت پُر رونق رہتا تھا ۔ محلہ کی ہی بات نہیں قصبہ بھر کی با تونی عورتوں کا وہ آماجگاہ تھا آج اس اللہ ہو کی کہانی ہی یہاں رونق کا باعث بنی ہوئی تھی وہ بیٹھی ہوئی سب عورتیں اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا کرتی تھیں لیکن بہو جب وہاں سے گزری تو سب کی سب خاموش ہو گئیں ۔ کوئی اپنا چرخہ لئے سرک گئی کوئی باتوں کو چھوڑ کر اپنے کام میں لگ گئی فاطمہ نے جیسے مجلس سے ہی استعفا دے دیا ۔ رحمت تھی جو پاٹ بیلتے ہوئے کچھ ایسے دکھائی دے رہی تھی کہ اس کے منہ میں زبان ہی نہیں ۔ بہو کو اگر پتہ لگ

جاتا کہ آج یہاں بحث کا موضوع ہماری خانہ جنگی ہی تھا تو نا معلوم وہ کس طرح ہنستی ہنساتی اور اس طرح سب کے ہوش گم کر دیتی نہ کہ سب کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔

بہو کے چلے جانے پر پاپڑ والی رحمت کہنے لگی ـــــ آج تو بہو کو میر کو دیر ہو گئی ـــــ نہیں تو اس وقت تک گھوم پھر کر واپس آچکی ہوتی تھی۔

فاطمہ بول اٹھی ـــــ ایک دن کی بات ہے کہ کنویں سے سویرے ہی سویرے دو گھڑے سر پر اٹھائے دروازے پر پہنچی کہ پہلی آواز ہی سے ساس نے دالان کھولا۔ اور فوراً گھڑا اتار لیا۔ لیکن شاید کیا وجہ تھی جب اپنا گھڑا اتار چکی تو نا معلوم وہ کپڑے کا ٹیکن جو سر پر رکھا ہوا تھا اتارنا بھول گئی اب تو ساس نے کچھ دیر بعد ایسا اودھم مچایا کہ خیر نہیں کہتی تھی اسے اپنی ہوش ہی نہیں اور بہو تھی جو سمجھدار ہونے پر رونے چلانے لگ گئی اور ساس تھی جو کہتی تھی۔ کتنی دیر کی کنویں پر پانی لینے گئی تھی اب آئی ہے۔ اس نے دیر کہاں لگائی۔ اور پھر آئی تو سر سے ٹیکن اتارنے کا بھی خیال نہیں۔ اتنی لڑائی بڑھی کہ انت ہو گئی۔ اس وقت اس بچاری نے دبی زبان سے کہا ـــــ خیال نہیں رہا برتن صاف کر رہی تھی ہاں نقصان کر کے ٹیکن جھاڑ کر دھوپ میں ڈال دیتی ہوں کچھ دیر تو لگے گی اس قدر غصہ کیوں کرتی ہو ذرا چپ رہو۔ اس قدر کیوں طیش میں آجاتی ہو ماں جی! کسی طرح جینا نہیں تھا۔ نا معلوم کون سی خطا ہوئی کہ خدا نے یہاں دھکیل دیا۔

اے خدا! میری حالت پر رحم کر۔ یہ کہہ کر بہو اس قدر پھوٹ پھوٹ کر روئی جیسے ساس اسی کو چبانے کو ہے۔

رضیہ بولی " محلہ بھر میں ان کی کسی سے نہیں بنتی کوئی اس کے دروازہ پر پہنچی کہ فی الفور گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی کہ کئی اس کی بہو ہے بھلا کیا بولے وہ رانڈ تو کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔

اس وقت آنگن میں سانپ نکل آیا۔ سب عورتیں اپنی اپنی جان لیکر بھاگیں۔ بھگدڑ مچ گئی۔ محلے والے لاٹھیاں اٹھائے آگئے لیکن سانپ مارے جانے سے پہلے ہی پھر بل میں گھس گیا۔

گھر میں آمد

معین الدین امپیریل بنک دہلی کے آفس سے بدل کر بنارس آگئے ہیں اس کی ماں کو اس کا قطعی علم نہ ہوا اس لئے عید کی چھٹیوں سے پندرہ دن پہلے ہی بیٹے کو گھر آیا دیکھ کر بے ظہورن جو بدقسمتی سے سلمہ کی ساس بن چکی تھی حیرت زدہ رہ گئی

معین الدین نے الہ آباد میں بی اے کرتے وقت تھیوسافیکل سوسائٹی کے زنانہ کالج سے اسی سال کامیاب ہوئی سلمہ نام کی سولہ سالہ پرشباب لڑکی سے شادی کر لی۔ اس رسم میں اس کی ماں ظہورن بھی الہ آباد آئی تھی بہاولپور جیسے گاؤں میں اس جدید قسم کی شادی کا رنگ اچھی طرح نکھرنے کی امید نہیں تھی اسی لئے الہ آباد میں کٹھ جوڑے کی تجویز ہوئی تھی۔ نہایت

خوش اسلوبی سے یہ تقریب کامیاب ہوئی۔ ماں دیکھ کر باغ باغ ہو اٹھی۔ اس کو خاوند کی موت کے بعد بیٹے کے بیاہ کا بڑا فکر تھا بیٹی زینب کی شادی تو معین کے باپ نے اپنی زندگی میں ہی کر دی تھی۔ اور بیٹے کی شادی کا غم لئے آپ بعد میں حصول تسکین کے لئے پہنچ گئے تھے اس لئے ظہورن کو یہ بوجھ برداشت کرنا دوبھر معلوم ہوتا تھا لیکن جب بیٹا کوشش اور جستجو کے بعد اپنی رفیقہ حیات کو تلاش کر لیا تھا۔ ماں کی خوشی کی انتہا نہ رہی جیسے بلا داد و فریاد رحمت الٰہی نازل ہو پڑی ہے لیکن جب بہو گھر میں داخل ہوئی اس وقت نا معلوم بی ظہورن کو کیا ہو گیا

بیاہ کو ابھی ایک سال گزرا ہی نہیں تھا کہ اسکی بیٹی کا نصیبہ پھوٹا اس کا دولہا، ساس، سسرال اور جیٹھ سب پلیگ کی نذر ہو گئے اس لئے زینب بے آسرا ہو کر میکے چلی آئی۔ اور ماں کی دلاری حال سے ساتھ میکے رہنے لگی

آج جیٹھ کی تپتی دھوپ میں جب کسان کھیت میں ہل جوت کر گرمی کی تیز حدت سے بے تاب ہو کر نئے فصل کی تیاریوں میں آنے والی فصل کی امید پر پیچ بو رہے تھے۔ معین الدین اسٹیشن سے گھر پہنچے

زن و شوہر کی ملاقات

اف بڑی گرمی ہے پنکھا نہیں ہے۔ کیا کیا جائے جان نکل رہی ہے۔

"یہاں دیہات میں ایسی چیزیں کہاں؟"

معین الدین فی الفور اٹھ کر بیٹھک میں گئے اور دو خوشنما پنکھے اٹھا لایا

بڑھیا پنکھے دیکھ کر سلمہ خوش ہو گئی بولی

"کہاں سے یہ پنکھوں کی جوڑی خریدی ہے؟"

کیا بتاؤں میرے ایک دوست کلکتہ سے دہلی جا رہے تھے۔ ان کے ہمراہ میں آیا ہوں۔ ان کی تبدیلی بھی کلکتہ کو ہوئی ہے انہیں کے ساتھ بازار میں گھومنے پھرنے گئے تو یہ دونوں پنکھے نفاست کی وجہ سے پسند کر کے خرید لئے

اب ان کے ہاتھ سے پنکھا لے کر بیوی خاوند کو پنکھا کرنے لگی اور باتوں ہی باتوں میں کہنے لگی ——— اچھا تم تو کالج کے گریجویٹ ہو بھلا اس شعر کا مطلب تو کہو

آئینۂ عبرت ہے تصویر حقیقت ہے آغاز محبت کا انجام محبت کا

معین الدین یکسوئی میں سوچ رہے تھے۔ کہ کبھی طرح بیوی سے بحث نہ کرنی پڑے وہ کئی بار تجربہ کر چکے تھے۔ کہ کس طرح زیادہ پڑھی لکھی نہ ہونے کے باوجود سلمہ سے کالج کے گریجویٹ کو منہ کی کھانی پڑتی ہے اب بیوی کا سوال سن کر یہی مثل ہوئی کہ جو مریض چاہے وہی طبیب بتلائے بولے "شعر تو عشق و محبت کی نقاشی ہے"

سلمہ نے پوچھا ——— "تم لوگوں کی سمجھ میں اس شعر کی کچھ قدر و قیمت بھی ہے؟"

اس میں بھلا تم اور ہم کی کیا ضرورت لاحق ہوئی؟"

اور نہیں کیا تم تو ہوئے ماشاء اللہ مرد اور عورت ذات ہوئی آپ کے رحم و کرم کی محتاج، زمین و آسمان کا فرق ہے ذرا اپنا مردانہ نظریہ تو بتاؤ، اگر یہی کچھ ہے تو عورت ذات، مردوں کی ہر معاملہ میں تائید و تصدیق سے

کیوں اجتناب کرتی ہے

وجہ یہ ہے کہ ہر جگہ تم لوگوں کی عقل دستگیری نہیں کرتی۔ اور آج کل کے شوہر تو تہذیب مغرب کے دلدادہ اور ان کی سرشت میں تقلید کا بھوت اس قدر سوار ہے کہ ہر معاملہ میں اپنی عقل کا فیصلہ بھی نہیں لے سکتے۔

تو کیا تم عورتوں کی سمجھ میں ہم گریجویٹ لوگ ہوئے اندھے ہو گئے کیا؟

پورے اندھے نہ سہی آنکھوں میں تو قدرے غبار آ ہی گیا ہے "

" اچھی بات ہے ایک درس تو تم سے لے لیا "

" بہت کچھ سیکھو گے لیکن جو کچھ میں نے دریافت کیا —— "

" اچھا دریافت کرو۔ پوچھو کیا پوچھتی ہو اندھے کی باتوں پر کیا تسلی ہو جائے گی؟

" وہ تو ہمارے ہاتھ کا معاملہ ہے جو چاہو کہو "

اچھا اب اصل مقصد کی طرف آؤ۔ تم ابتدائی گفتگو میں کافی وقت ضائع کر چکی "

منطق دانی

مسکراتے ہوئے سامنے کہا —— اصلی بات تو میں کہہ ہی چکی ہوں "

" ہاں وہ شعر تو ٹھیک ہے شعر میں بے پناہ حقیقت پنہاں ہے "

" لیکن اس شعر کی شرح آسان اور سادہ طور پر مجھے سمجھا دو "

گو مطلب تو اس کا اس قدر پیچیدہ نہیں ہاں محبت ایک پُر سرور سے ہے جو زن و شوہر کو دنیائے دوں کی دلفریبیوں میں سرمست رکھنے کے لئے لذت کے مشابہ ہے لیکن اس کی شیرینی کا لطف زبان سے بیان ہونا ناممکن ہے۔ اور حقیقت ۔وہ تو ایک راز پنہاں ہے جس کو پراگندہ کرنے کے لئے لیلا و مجنوں ، وامق و عذرا۔ شیریں و فرہاد وغیرہ کتنے ہی قصاسیاران عشق نے اپنے آپ کو پیش کیا لیکن اس کے باوجود یہ راز ہے جو ابھی تک شرمندہ تعبیر ہے اس کے آغاز و انجام کا فسانہ تیار ہی نہیں ہو پایا عبرت کی کیا پوچھتے ہو۔ عشق و محبت اور عبرت کا درس۔ کیا سنا نہیں مثنوی زہر عشق" میں آیا ہے ؎

عشق سے کون ہے بشر خالی
کر دئیے ہیں اس نے گھر کے گھر خالی

لیکن اس کے باوجود کسی کو عبرت نہ ملی دشت و بیاباں میں اور چپتے ہوئے رہگذاریں ہاں ہاں متواتر سرگرم رفتار رہتے ہوئے ان کی تابش اور رات کی سکون کی مدد سے بھی عبرت اور عبرت کا ملنا محال ہے محبت اور عبرت۔ کیا پوچھا نہ عشق کو عبرت ملی اور نہ معشوق کو، عورت و مرد کا یہی حال ہے حوادث روزگار بھی تو اس سے زیادہ روشنی ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو سکے "

اس قدر کہتے کہتے جب معین الدین ذرا متین ہوتے جا رہے تھے ۔ تو سلمہ نے درمیان میں ہی پوچھا ——— کامیاب؟ یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

اصل مقصد یہ ہے کہ شاعر کے خیالات کو شعر کے ذریعہ بیان تو کر دیا جاتا ہے لیکن شاعر کے صحیح جذبات کی ترجمانی شارح سے بھی ممکن نہیں ہوتی"

"کیوں؟"

"شارح درحقیقت شاعر کے جذبات اور احساسات کی تہ تک نہیں پہنچے اسی شعر میں ہے تو جذبات کا ایک سمندر موجزن لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شاعر کو کیسی چوٹ لگی۔ اور وہ اس کو درپردہ رکھنے کی بجائے ان الفاظ میں کیسے کہہ گیا جس پر آج ہم لوگ جھوم رہے ہیں"

"کیا تم بھی؟"

"دل کی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ یقین کرنا ایک بات ہے اور دیا ؤ میں آکر تسلیم کرنا دوسری، محبت کے آغاز و انجام کا پتہ لگانا آسان نہیں ہے دن بھر کے فکر اور رات کے غور و خوض سے اس کا پورا پورا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

لیکن اس قدر غور کرنا مناسب ہے کہ محبت میں وہ کونسا جادو ہے جو آغازِ عالم سے دنیا پر اپنا سکہ جمائے ہوئے ہے اور وہ کونسا راز ہے جس کی حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی روز و شب کوششیں دیکھنے میں آ رہی ہیں۔ یہ درست ہے کہ محبت ایک حقیقت ہے لیکن اس کے رازِ نہاں کو جھوٹ اور غلط قرار دینا سب سے بڑی جہالت ہے؟"

دنیا کے بڑے بڑے عالموں اور مفکروں نے اپنا اوقات عزیز صرف کیا۔ لیکن اصل حقیقت کا پتہ نہ پا کر کوشش اور کاوش سے جسقدر تجسس کا اظہار ہوا۔ اسی قدر محبت کا راز ورے ہوتا ہوا بھی پیچیدہ تر ہوتا چلا گیا ہے محبان عالم نے چراغ سحری لیکر دنیا کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن اس کا آغاز اور انجام خدا والی بات رہی غیب کی بے پناہ قوت خود بخود آدمی کو بیدار کر دیتی ہے اور وہ سب کچھ جاننے لگ جاتا ہے مگر اس کا یہ جاننا قطعی اور تسلی بخش نہیں ہوا کرتا۔ محبت کی آگ وصل سے تیز تر ہوتی ہے اور وہ اسقدر شعلہ زن ہو جاتی ہے جس سے زندگی اور موت کے درمیان تفاوت تک دکھائی نہیں دیتا۔ محبت اور صرف محبت پر ہی دنیا کا چلن ہے انسان حیوان چرند پرند اور حشرت الارض میں بھی محبت کا جلوہ دیکھنے میں آتا ہے ایک جاہل اور عامی سے لیکر فلاسفر تک محبت کے جادو سے مسحور ہے ۔"

"بھلا تمہاری رائے کیا ہے ؟"

"ہماری رائے ؟ ہماری رائے کی قدر و قیمت ہی کیا ہے "

"میرا یقین تو آپ کے اعتماد پر انحصار رکھتا ہے "

"ارے یہ سچی بات کہی یا اس میں ابھی کوئی روحانی نکتہ ہے ؟"

"نہیں نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ ہاں یہ بھی یاد رکھو میرے اعتقاد پر مخول نہ اڑاؤ "

"اچھا تم تو سچی ہی بات کہتی ہو "

"کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں تم سے ؟"

"اچھا اب سنو، اچھا میں اپنے دل کی بابت تمہیں بتاتی ہوں جو صرف اعتقاد پر انحصار رکھتی ہے گو میرا اس پر یقین ہے

بیشک سلمہ کیسی ہی ہو تو کیا اسے غور و فکر سے مس نہیں ہے اسے احساسات کی خوابیدگی اور بیداری کا پتہ ہے اور اسے یہ علم ہے کہ روحانیت کا محبت سے رشتہ منضبط ہے اور پوشیدہ طور پر وہ کس طرح سلگتے ہوئے انسان کو بیدار کر دیتی ہے اسی لئے آغاز و انجام کو جانتے ہوئے کچھ نہیں جانتی اور نہ جانتے ہوئی بعض اوقات غرور کا دم بھر لیتی ہوں اس مصرعہ کو کئی بار گنگناتی ہوں اور مست ہو جاتی ہوں"

معین الدین نے مسکراہٹ کے علاوہ سلمہ کی گفتگو کا کوئی جواب نہ دیا

آغازِ جنگ

باتوں ہی باتوں میں تین بج گئے۔ سلمہ گھر کے کام دکاج کو یاد کرتے ہوئے بولی :۔ "تو اب میں جاؤں نہ"

"کہاں جاؤ گی"

"سارا کام ابھی باقی ہے"

"آج ہی تو گھر میں ہوں رات کی گاڑی الہ آباد چلا جاؤنگا اتنی تکلیف دہ نوکری ہے۔ کہ چھٹی نہیں ملتی۔ اب اگر زندہ رہے تو بڑے دنوں کی رخصت پر ملاقات ہوگی"

"کیا عید کی چھٹی نہیں ہے ؟"

"نہ!"

ارے! یہ کیسی نوکری ہے دس پندرہ روپے کے نوکر عید منانے گھر آ جاتے ہیں تم سو روپے ماہوار کے ملازم ہو کر عید کی چھٹی نہیں لے سکتی"

جس کی تنخواہ جس قدر زیادہ ہو وہ اس کی غلامی کی زیادہ روشن دلیل ہوا کرتی ہے مجھے تبادلہ میں دو دن کا وقفہ مل گیا ہے اب جلد آنے کا موقع نہیں ملیگا۔ کام اسقدر باقی پڑا ہے کہ شب باشی کے باوجود عید تک شاید ہمارا کام ری اپ ٹوڈیٹ ہو۔ اس وقت دفتر میں جیسی گذر رہی ہے وہ میں جانتا ہوں اور اب جو دفتر میں معروف کار ہیں وہ عید پر آرام حاصل کر پائیں گے اب بڑے دنوں کی رخصت پر ہی آؤں گا۔

"ہم کو بھی پھر کیوں وہاں نہیں لے جاتے؟"

"ارے! کیا ہم کو بھی تم خود غرض بناؤگی کیا؟

"خود غرض کیسے؟"

"وہاں تو جانا نہیں چاہتی"

اب سلمہ نے بھی سانس لے کر شوہر کی طرف دیکھا اور اندر ہی اندر دل مسوس کر رہ گئی۔ پھر حوصلہ کر کے بولی ——"ہاں تو ابھی ضرور کچھ دن لگیں گے گھر کے برتن وغیرہ کا کام ابھی پڑا ہے۔

"کیوں سب کام تم ہی کروگی"

"اور کون کرے گا"

"کیا نوکرانی نہیں ہے؟"

"وہ آتی کب ہے؟"

"وہ کیوں نہیں آتی؟ کیا بات ہے؟"

ماں نے اس کو جواب دیدیا ہے۔ کہتی ہے اس قدر کام کے لئے ڈیڑھ روپیہ کیوں دیا جائے؟"

یہ تو اچھا نہیں ایک مہذب عورت سے گھر کی صفائی اور برتن دھونے کا کام تو نہیں ہو سکتا۔"

"میں تو یہ سب کرتی ہوں"

"کیا تم اور ہمشیرہ مل کر کرتی ہو"

نہ اسے تو کبھی کبھی بخار ہو جاتا ہے وہ یہ کام نہیں کرتی"

بخار کا ذکر ماں نے تو نہیں کیا۔ اور تم نے بھی پہلے نہیں بتایا کچھ علاج بھی ہوتا ہے یا نہیں؟"

"اب تو بخار نہیں ہے پہلے سردی لگی تھی پھر بخار آیا تھا"

"پھر کیسے ہوا کیا اب تو بخار نہیں آتا"

"ہاں ماں جی تو یہ کہہ کر کہ بخار آتا ہے اسے کام نہیں کرنے دیتی"

"نہیں کرنے دیتی تو نہ سہی لیکن اس کو تو رکھ لینا ضروری ہے خدمتگاران کے بغیر کام نہیں چل سکے گا۔ اور ہم ایسے ذلیل تھوڑے ہیں جو نوکرانی ہٹا کر مفت کی تکلیف اٹھائیں تم اتنے وقت میں سینے پرونے کا کام کرکے جو گن مفید رہ سکتی ہو۔ اچھا اپنا ہارمونیم تو لاؤ۔ یہ وقت تو تمہارا لطف سے گزرے اچھا گانا سنے کافی دن گزر گئے۔

"یہ تو میری خوش بختی ہے لیکن تمہارے جانے پر اماں جان کو جس قسم کی تکلیف ہوگی وہ از حد ناقابل برداشت ہوگی"

"نہیں نہیں کیا غصہ منائے گی؟"

اب سلمہ وہاں سے فی الفور اٹھی اور ہارمونیم لاکر کھولنے لگی پھر چھاڑ پھونک کر کے ملاقی ہوئی بولی "اچھا گاؤ"

"نہیں تم ہی گاؤ"

اب سامنے سے گانے لگی

تو آقا ہم تیرے بندے کرم تیرا شیوہ یاں ہاتھ میں کاسہ گدائی کا

بھلے ہیں یا برے ہیں تیرے ہیں تیرے در پہ حاضر ہیں۔

تو آقا ہم بندے تیرے . . . . .

اس دعا سے اس خانہ تاریک میں روحانی ضیا جلوہ افروز ہوا اٹھی۔

پھر دوبارہ سلمہ نے گایا

نسیما جانب بستان گذر کن۔

بگو آں دلبر شمشاد مارا

بتشریف قدومے خود زمانے

مشرف کن خراب آباد مارا

معین الدین وجد میں آگیا۔ اور پُر سرور انداز سے سلمہ کی توتلی زبان کے جادو کو نہارنے لگا۔ اسی بیچ میں اماں نصیرن کواڑ کھول کر اندر آگئی یہ دیکھ کر سہمی ہوئی نیم بسمل پرندے کی طرح لوٹ پوٹ ہوتی سلمہ سب کچھ چھوڑ

الگ جا کھڑی ہوئی۔

معین جو مست ہوتے جا رہے تھے۔ اماں کی اچانک آمد سے خوش نہ ہوئے لیکن برا بھی نہ منایا۔ دل ہی دل میں انہوں نے سمجھا۔ کہ کسی ضروری کام کیلئے آئی ہونگی مگر سلمہ نے جب ان کی طرف دیکھا۔ تو چہرہ سرخ اور آنکھیں تمتماتی ہوئی ہیں تاہم انہوں نے پوچھا" کیا ہے اماں؟"

اب تو اماں جیسے آسمان سر پر اٹھائے بولی ——— اب کیا پوچھتا اب تو اس گاؤں میں رہنا مشکل ہے۔ اب تو ہم سے ہر شخص نفرت کرے گا۔ نہ —— نہ ——

یونیورسٹی کا گریجوٹ معین الدین باوجود تعلیمیافتہ ہونے کے اپنی ماں کے جواب کا مطلب سمجھ نہ پایا۔ جیسے بعید از فہم گفتگو کو سن کر طالب علم اپنے استاد کا منہ دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ ویسے ہی معین منہ بنائے اپنی اماں کی طرف دیکھنے لگا۔

سلمہ سب نہ سہی لیکن قدرے سمجھ گئی۔ اسے معلوم ہو گیا۔ کہ یہ حرف ابتدا ہے اب بوچھاڑ ہوئی چاہتی ہے۔ اسی لئے بجلی کی کڑک دیکھ کر بادلوں کے شور وغل سے مسافر بارش کا امکان خیال کرکے درختوں کے سایہ میں کھڑا ہو جاتا۔ اسی طرح سلمہ الگ کھڑی رہی۔

جب زن وشوہر میں سے کسی نے بھی اس سوال کو حل دریافت نہ کیا۔ تو ماں نے ہی تقریر شروع کردی بولی ——— کیسے کوئی ہم سے کرے گا بھلے گھر کی عورتیں اس طرح بے حیا بن کر گانا بجایا تھوڑا ہی کرتی

ہیں۔ یہ کام جانتے ہو کون کرتی ہیں۔ زمانہ بھر کی بد اخلاقی اور سیہ کار عورتیں بھی گانے بجانے کے شغل میں خوشی رہتی ہیں۔ جن عورتوں کو گھر گرہستی کا فکر نہ ہو۔ وہ بے شک بازاری پن کا ثبوت دیں۔ لیکن ہمارے جیسے تہذیب و شریعت گھرانے میں یہ آفت اللہ یہ کیا ہو گیا۔ کیسی بہو ہمارے پالے پڑ گئی۔

ارے معین! کیا تجھے بھی شرم نہ آئی۔ الہ آباد جا کر جو جی میں آتا کھیل کھیلتا۔ گاؤں میں ایسا کام از حد معیوب اور بڑا سمجھا جاتا ہے تم تو یہ اچھی طرح جانتے تھے۔

اب معین الدین اصل حقیقت سے آگاہ ہو کر بولے —— تو اس میں یہ برائی ہے خالی"

ارے یہ مخول اور ہنسی کی بات نہیں تم بے معنی طور پر کیوں مسکراتے ہو یہ ہنسی تو آفت ہے تو انگریزی پڑھ کر کرسٹانی پن کا یہاں کیوں شور مچاتا ہے آ اپنی بہو کو ساتھ لئے جا وہاں یہ سب ہونہ کرنا۔ جب تک ہماری زندگی ہے یہ ننگاپن میں یہاں نہیں دیکھ سکتی"

"سن تو اماں"

میں وہ سب سن چکی۔ بس جائے ایسا پڑھنا لکھنا۔ ایسی تعلیم بھاڑ میں جائے۔ موم عمر کیسے کٹے گی اور ہر کیہ گناہوں کا پھل ہے۔ جو ایسی بہو اور ایسا اچھا بھلا لڑکا خراب ہو گیا۔ ہائے میں کیوں نہ تیرے باپ کے ساتھ قبر میں چلی گئی۔ کیا ان برائیوں کے دیکھنے کیلئے مجھے زندہ چھوڑ گئے تھے۔

اللہ۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ دیکھتا نہیں جاتا ــــــ یہ دیکھا نہیں جائیگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

معین الدین ماں کی ان غضب ناک باتوں سے کافی دکھی ہوئے اور قدرے ناراض ہو کر بولے ــــــ کوئی ہمارے ساتھ تعاون نہیں کرے گا تو جائے جہنم میں اور پڑے بھاڑ میں ہم کسی کو مارو کیلئے پکار تو نہیں رہے جیسے دم دبانے سے سانپ اچھل پڑتا ہے ویسے ہی پھنکار مار کر معین الدین کی ماں بولی ــــــ بڑی اکڑ فوں دکھاتا ہے تو جا کیا گاؤں میں نہیں رہنا۔ ہماری زندگی تو یہاں ہی کٹی ہے اور کٹے گی "

اب معین الدین کو غصہ آیا۔ اور وہ بولا ــــــ تم تو ماں اتنا جلدی اشتعال میں آجاتی ہو کہ کیا ــــــ "

بات پوری ہونے سے پہلے ہی معین الدین کی ماں گرج اٹھی بولی:-

"آگ بگولہ کیسے نہ ہو جاؤں۔ تم تو اپنی داڑھی خود نوچ رہے ہو باپ رے باپ!! آدمی کتنا کچھ برداشت کرے آخر کار بھلے گرہستی کا گھر ہے دن دوپہر بھلے گھر کی بہو اس طرح بیٹھی باجا بجائے۔ اور منہ پھاڑ پھاڑ کر اپنی آواز سنائے۔ بھلے گھر کی عورتوں کی آواز بھی تو دوسروں کے کانوں میں کبھی نہیں پڑی۔ یہ عجیب آئی ہے۔ جو راگ الاپ کر آسمان سر پر اٹھا رہی ہے۔ اور ہماری عزت خراب کر رہی ہے گاؤں میں کسی کو کیسے منہ دکھاؤں گی۔ اور اگر کوئی پوچھے گا تو کیا کہوں گا غضب ہو ہے کوئی اس

کی ایسی خراب حرکتوں کو کیسے برداشت کریگا۔ میں تو جیتے جی مرگئی۔ میری عزت و حرمت اور ساری عمر کا رکھا رکھاؤ خاک میں مل گیا۔

دیکھو اماں! تم اس قدر سیخ پا کیوں ہو رہی ہو ہر معاملہ کی حد ہوتی ہے۔ اور زیادتی تو کسی بھی پہلو میں اچھی نہیں تم جو اس قدر غصہ دکھا رہی ہو کس لئے کیا خانہ جنگی پیدا کرنا چاہتی ہو۔ کوئی کہاں تک تمہاری زیادتیوں کو برداشت کرے گا "

ہاں بیٹا! تم بھی ہمارے پیر بننے لگے بڑے عقلمند ہو گئے ہو میں ہی بے وقوف نکلی ساری عمر میں کچھ سمجھ نہ پائی۔ گھر اثاثہ تھا کہ بڑھاپا اور یہ پھل پایا ہائے میری قسمت پھوٹ گئی اللہ! میرے اللہ! میں اپنی رانڈ بیٹی لے کر کہاں جاؤں، بیٹا بھی اب کھانے کو دوڑتا ہے۔ اور بڑھاپا یوں جان کو عذاب بن رہا ہے۔"

"ماں تم کو یہ کیا ہو گیا۔ آج پاگل تو نہیں بن گئی۔ عقل کہاں جاتی رہی

"عقل جائے تیری دلاری کی اور پاگل ہے تیری گانے بجانے والی بہو بھلے گھر کی بیٹی ہوتی تو بھلا چلن دکھاتی۔ تیرا کیا تیرے پیش آئے ایسی بے شرم سے جی لگا کر تو پاگل ہو گیا ہے"

رانڈ بیٹی لے کر گھر گھر بھیک مانگ کر پیٹ پال لوں گی ہمارا رانڈاپا بھی کٹ جائے گا۔ تو اپنی جوانی بھر پالے گا۔ تو اپنی بے شرم کی فکر کر۔ ہمیں کیا جب ہاتھ کاسہ گدائی پکڑ لیا۔ تو پھر فکر کاہے کا ہے"

"اگر مقدر میں یہی ہے تو کٹے گی تھوڑے ہی"

ارے اتنا گھمنڈ نہ رہے گا۔ غرور اچھا نہیں ہوتا۔ اللہ خود بخود مغرور کا سر نیچا کر دیتا ہے۔ ابھی تو دنیا کا چلن بگڑا نہیں ہے۔ سورج چاند اسی طرح نکلتے ہیں ایمان زائل نہیں ہو گیا۔ ابھی اس کا کچھ نشان باقی ہے تیری اماں نے دس ماہ تجھے پیٹ میں رکھا ہے۔ اس بوڑھی کا شرم نہیں اس سے بہتر تو یہ تھا کہ پتھر پیدا ہوتا۔ اف کیا کروں! یہ رانڈ بیٹی ان کے جی میں اکھرتی ہے اگر یہ نہ ہوتی تو کون تیرے دروازے پر تھا۔

معین الدین کی ماں بک جھک کر چلی گئی۔ توسٹ پٹا کر سلمہ بولی "ہاں سن لیا ـــ دیکھ لیا۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ ماں ہے ماں کا درجہ تو سب سے بلند تر ہے"

سہیلی ظہیرن

اسی رات معین الدین نوکری پر چلا گیا۔ ادھر سلمہ اپنی ساس کے غصہ میں جل بھن رہی تھی۔

یہ ساس بہو کی جنگ زرگری کوئی نئی بات نہیں آج کل ہمارے ملک میں گھر گھر ساس بہو کی اس قسم کے سلوک کی داستانیں سننے میں آئی ہیں۔ اس قسم کی لڑائی جھگڑے اور دھینگا مشتی کا باعث صرف کھچاوٹ ہوا کرتی ہے۔ ساس جب بہو کو گھر میں دیکھتی ہے تو خیال کرتی ہے کہ اب گھر میں اجالا ہو گا۔ بہو کی شیریں گفتاری اور حسن سلوک سے اس

اس کا گھر گلزار بن جائے گا۔ بہو کے سہارے بیٹھ کر اپنی زندگی کو آرام دہ بنا سکے گی۔ اور ہر حکم اور اشارہ پر بہو سر تسلیم خم کیا کریگی۔ اور نیک خواہشوں کے اثر سے بہو سے مل کر زندگی گذارے گی۔ لیکن جب ساس کی خواہشوں کا خون ہونے لگتا ہے۔ جب بہو آکر ساس کو مالکن نہیں بلکہ بھکارن بنا دیتی ہے۔ اور چند یوم میں بیٹے پر بھی اثر ڈال کر اسے اپنا متنفر کر ڈالتی ہے۔ اس وقت ماں آسمان سے گرتی ہے اس سے اس کا مزاج نئے حالات کی وجہ سے کرخت ہو جاتا ہے۔ اگر بہو آج کل کی تعلیم یافتہ ہوئی ملی تو نئی روشنی میں تاریکی پھوٹ پڑتی ہے۔

اگر ساس اور بہو کچھ اپنا اپنا قربان کر کے آپس میں مل کر خانہ داری کو راحت بخش بنانے پر دھیان دیں۔ تو ہر گھر سے لڑائی جھگڑے کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

سلمہ اور اس کی ساس کی ان بن کی آگ برابر مخالفانہ ہوا سے شعلہ زن ہوتی رہی ہو گی۔ اس کے باوجود بھی معین الدین نے اپنی بیوی کو کسی چٹھی میں کبھی کوئی ذکر نہیں لکھا۔ ساس کی ساری زبردستی غصہ اور طیش وہ برداشت کرتی چلی گئی۔

سلمہ دل ہی دل میں کہتی تھی۔ کہ شوہر پردیس میں ہے نوکری میں سارا دن گزارتے ہیں میں ان کی کمائی سے گھر میں عیش کرتی ہوں۔ اگر گھر سے اپنی تکلیف لکھ کر انہیں تکلیف دوں۔ تو یہ کہاں تک مناسب ہو گا۔ میرا شوہر ہی میرا مالک ہے۔ اور یہ مالک کی اماں میرے واسطے تو یہ خدا کے

بعد کا درجہ رکھتی ہے۔ یا کہہ دوں کہ خدا کا تو غلط نہیں ہو گا جو اس کے جی میں آئے کہے گالی دے۔ مارنا ہو تو مارے۔ لیکن میرے بیگناہ ماں باپ کو چھوٹا آدمی کہے۔ یہ بڑی تکلیف دہ بات ہے۔ اسی دکھ اور اسی ناقابل برداشت احساس کی وجہ سے میں دل ہی دل میں گھل رہی ہوں۔ اس قسم کے خیالات میں مستغرق سلمہ ایک روز شام کو برآمدے میں بیٹھی سامنے لیمپ رکھے خیالات میں محو تھی۔ کہ اتنے میں محلہ کی پڑوسن سہیلی ظہیرن نے جو سسرال سے تین دن ہوئے آئی تھی۔ مسکراتی ہوئی آ پہنچی۔ اس نے آتے ہی معین کی رنڈی بہن ذوالفقار سے پوچھا۔ ذوالفقار ظہیرن کی بچپن کی سہیلی تھی ان کی ملاقات ہوئے کافی عرصہ ہوا تھا۔ کچھ دیر دونوں میں محبت کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ظہیرن نے سلمہ کا ذکر چھیڑا۔ وہیں ساس بھی بیٹھی تھی بولی۔ کیا کہوں ظہیرن! ہمارے گھر میں دو چار بیٹے ہی نہیں یہی لڑکا اور بہو ہمارا عمر بھر کا اثاثہ ہے۔ لیکن کیا کہوں ہمارا نصیب پھوٹ گیا۔ ظہیرن ہم کو بہو اچھی نہیں ملی۔

ظہیرن ہمدردی دکھا کر کہنے لگی —— کیا کہا اماں! کیا بات ہے؟ تم اس قدر تکلیف کیوں محسوس کرتی ہو۔ اس طرح کی باسلیقہ بہو ایسی ملنسار پڑھی لکھی بہو آئی اب کیا ہو گیا جو تم دکھی ہو رہی ہو؟

ہماری قسمت پھوٹی ظہیرن! دوسروں کو کیوں الزام دوں ہماری ہی بد قسمت بیٹی ہماری تو موت ہو رہی ہے"

اس میں ذوالفقار کا کیا منھ بھر آتا اور ساگ بھات اس کا تو سب کرتا

دھرنا سب بھرجائی کے لئے ہے ذوالفقار سے غیریت کیوں اس سے کیا بانٹنا ہے لڑائی جھگڑا کیسا؟

ظہیرن تم تو جانتی ہو میری ذوالفقار تو جھگڑالو نہیں ہے اور اگر کبھی اصرار کرے تو وہ بھی لمحہ بھر کے لئے گھر میں برتن دھرے ہیں ان میں بھی ٹھوکر لگ ہی جاتی ہے یہ تو کوئی بھلے گھر کی بات نہیں آپس میں عورتیں پڑی منہ پھلائے پڑی رہیں۔ کچھ کام دھام نہ کریں صرف نکتہ چینی ہی کرنا اپنا فرض تصور کریں۔ اس بد نصیب ذوالفقار کے لئے دن بھر لڑائی ہوتی ہے روزانہ کی تکرار سے محلے بھر کی عورتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔

ظہیرن سمیعہ کو اچھی طرح جانتی تھی۔ ساس نے بہو پر جو الزام لگائے ان پر توجہ نہ دیتے ہوئے کہنے لگی۔

"بہو جی ہیں کہاں؟"

وہیں برآمدے میں منہ پھلائے بیٹھی ہے یہ ہماری بد قسمتی ہے۔

ظہیرن کے گھر میں دو بہوئیں ہیں ہنستی کھیلتی رہتی ہیں اگر یہاں بھی دونوں گھر سنبھال کر رہیں تو بہشت بن جائے۔

"اماں جی تم چاہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے تمہاری بہو تو دل خوش کن طبیعت والی ہے"

"اچھا بیٹی! تمہارے منہ میں مٹھائی پڑے۔ اس کی اللہ عادت بدل ڈالے اور گھر کی بے چینی دور ہو"

ہنس کر ذوالفقار نے پوچھا ــــ "کیا تمہاری بہو کو کوئی بیماری ہے جو اس کے دور ہونے کو کہتی ہو"

"ہاں یہ بھی ایک قسم کا آزار ہوتا ہے"

اب ذوالفقار اور ظہیرن دونوں سلمہ سے ملاقی ہونے چلیں شام کا وقت تھا۔ چراغ جلنے کی راہ دیکھتا ہوا سلمہ کے پاس پڑا تھا۔

سلمہ بیٹھی خیالات میں مستغرق آفتاب کی سرخی پر نظر جمائے ہوئے تھی اپنی ساس کی سخت حکومت اور نند کا بات بات میں الزام لگانا اور شوہر کے عرصہ کے فراق کا دل ہی دل میں خیال کر رہی تھی۔ شام کی خنک ہوا پُر لطف انداز میں تسکین بخش رہی تھی۔ ظہیرن نے اچانک وہاں پہنچ کر کہا ــــ لو یہ تو نیوٹن کی طرح کسی جدید اختراع کے خیال میں مستغرق بیٹھی ہے کیوں بھابی"

سلمہ اپنی وفادار سہیلی کو دیکھ کر فی الفور ہنس کر بولی ــــ "کب آئی ہو ظہیرن! آج کدھر کو آفتاب نکل پڑا"

"آب تو ڈوب رہا ہے بھابی، اس قدر فکر مت کرو۔ تمام تکالیف بھول کر خوش ہو جاؤ"

"میں تو خوش ہوں ظہیرن! کیا کرنا ہے جو قسمت میں لکھا ہے وہ ہونا ہے او کھل میں سر دیا موسل کی کون گنتی کرے

تم اپنی حالت بتاؤ خوش تو ہو؟"

"میں تو بشاش ہوں بھابی! اپنی سناؤ"

میری حالت تو تم خود جاننے والی ہو ع
"عاقل را اشارہ کافی است"

دونوں کے معما میں ذوالفقار نے اپنی ماں کی بے عزتی کا احساس کیا اس کے جی میں آیا کہ اٹھ کر چلی جائے۔ لیکن ظہیرن کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکی۔
ظہیرن اس گاؤں کے بڑے آدمی کی بیٹی تھی۔ وہ اچھی لکھی پڑھی تھی سب اسکی تعریف کرتے تھے۔ ظہیرن سلمہ کے پاس جا کر ہی بیٹھی۔ ذوالفقار کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اتنے میں مسجد سے اذان کی آواز آئی۔

سلمہ بھی چراغ جلانے لگی۔ لیکن دیکھتی ہے۔ کہ چراغ کا تیل زمین پر پڑا ہے اور حضرت چراغ اوندھے پڑے ہیں۔ زمین پر گرا ہوا تیل ظہیرن کا آنچل کافی تر کر چکا تھا۔ تیل کی طرح بتی بھی الگ پڑی تھی۔ حالات سے سلمہ کو احساس ہوا۔ کہ ذوالفقار کی عدم توجہی سے چراغ کا یہ حشر بھی ہوا ہے

اس نے کچھ کہا نہیں۔ چراغ سیدھا کر کے بتی ٹھیک کر کے جلانے چلی تو ظہیرن بولی۔ "واہ ذوالفقار! تمہارے چراغ دان سے اس بیچاری کو چھٹکارا نہ ملا یہ عجیب بات ہے"

ذوالفقار جھینپ تو گئی۔ لیکن ایسے حالات میں سمجھنے کی بے جا تائید کی وجہ سے اس کی ایسی عادت ہو گئی تھی۔ کہ تھوڑے میں ہی چمک اٹھتی اور غصہ منا لیتی تھی۔ اس دفعہ بھی یہی کچھ ہوا۔ گرمی کے موسم میں کسی سمت سے اٹھا ہوا بادل کا ٹکڑا جیسے آناً فاناً آسمان پر چھا جاتا ہے ذوالفقار کے خوشنما چہرے پر لمحہ بھر میں غصہ کے تیور دکھائی دیئے۔ وہ طیش میں ہی اٹھی یہ دیکھ

کر ہی ظہیرن بولی ـــــ "کہاں ذوالفقار"

جاتی ہوں بہن! کپڑا دھو ڈالوں۔ دیکھتی نہیں آنچل تیل سے تر بتر ہو گیا ہے

بھیا کی کمائی اسی طرح ضائع ہوتی ہے"

اس میں قصور تو تمہارا ہے۔ ذوالفقار! تم نے ادھر نہ دیکھا اور چراغ پر ہی جا بیٹھی۔ وہ تو تمہاری ٹھوکر سے الٹ گیا تھا۔ صرف لوٹنے کی ہی کسر تھی!

اب تو ذوالفقار نے منہ لٹکا لیا۔ دل میں سوچا بھابی کے اشارہ سے ہی ظہیرن اتنا کہہ گئی ہے۔ خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

اچھا بیٹھو ظہیرن! کہہ کر ذوالفقار اٹھی ہی تھی کہ ظہیرن بولی ـــــ

"آج تو دیر ہو گئی ہے! بھابی کل دوپہر کو آؤں گی۔ تو تم سے تنہائی میں بات چیت کروں گی۔"

یہ کہہ کر ظہیرن چلی گئی۔ سلمہ چراغ جلا کر گھر کے کام میں معروف ہو گئی۔

شوہر کا پیام

سلمہ کو جس کا خوف تھا۔ وہی ہوا۔ ساس نے سامنے بلا کر کہا۔ "دیکھ رے۔ تو کیا چاہتی ہے۔ جو جی میں ہے صاف صاف کہہ دے ہم وہی کرنے کو تیار ہیں"

سلمہ خوف سے لرزتی ہوئی بولی ——— مجھے کیا چاہیئے۔ اماں تم تو میری اماں ہو۔ تمہارا بزرگوں میں درجہ ہے جو حکم ہو کرنے کو تیار ہوں۔ میں آپ کے حکم کی بندی ہوں۔ مجھ سے ناحق ناراض نہ ہوا کرو اماں جی"

ہاں امید تو ہم تو ایسی ہی رہی۔ اللہ کا دیا ایک ہی معین الدین ہے کوئی دس پانچ بیٹے تو نہیں ہیں۔ اور تم ہو ہماری ایک ہی بہو، مجھے تو یقین تھا کہ تم ہمارے گھر میں آرام سے گھر گرہستی کو بہشت بنا دوگی"

تو میں کیا کرتی ہوں ماں جی"

کرنا کیا! تو ہے اودنے خاندان کی بیٹی! تمہیں لاکر ہم نے اپنے ہی گھر کو برباد کیا ہے"

ہاتھ باندھ کر سلمہ بولی ——— اللہ جانتا ہے ماں جی! بات کیا ہے کچھ سمجھ نہیں آتی۔ نہیں تو آپ کی بہو بیوی تمہارے قدموں کی دھول مجھ سے اگر کوئی گناہ ہو تو معاف کر دو ماں جی! بڑے بزرگ چھوٹوں کی غلطیاں معاف کر دیتے ہیں"

تم تو پڑھ لکھ کر سیانی بنی ہو۔ تم سے بھلا کون سی بات چھپی ہے لیکن میں دیکھتی ہوں۔ تمہارے سر سے پاؤں تک جیسے زہر بھرا ہے اصل بات یہ ہے کہ تو میری بیٹی کو دیکھ کر جلتی ہے اس کا تو نصیبہ پھوٹ گیا۔ رانڈ ہو گئی۔

لیکن تو چاہتی ہے۔ کہ اس کو گھر سے نکال دیں تم میرے جیتے جی ایسا

ایسا نہیں کر سکتی میں اس کو نکال کر تیری غلامی کروں۔ اور تو یہاں بیٹھ کر موج اڑائے گائے بجائے اور یہی نہ"

"یا اللہ! یہ کیسی بات کہی ماں جی! ایسا مت کہو"

" میرے کہنے سے تمہارا کیا بگڑتا ہے۔ چمار کے کہنے سے ڈھور تھوڑے مرتے ہیں"

کہو ماں جی! مجھ سے کون سا گناہ ہوا؟

بس کر حرامزادی! آخر تو ہے ادنے خاندان کی بیٹی! تیرا دل یہ چاہتا ہے کہ تو میری ذوالفقار کی بے عزتی کرتی رہے گی۔ تو جانتی ہے کہ اس کا مددگار کوئی نہیں ہے۔ ہمیں تمہارا کاہے کا ڈر ہے کیا تیرے باپ کی کمائی پر گزران خبردار جو پھر میری بیٹی کے متعلق کچھ کہا۔ تو تمہاری زبان اکھیڑ لوں گی۔ ہڈی پسلی الگ الگ کر دوں گی۔ میں دیکھوں گی کون تیری حمایت کرتا ہے"

"میں نے کہا کیا ہے ماں جی"

کاہے کا تم نے ظہیرن کے سامنے ذوالفقار کو طعنہ دیا ہے کیا وہ تمہارے پاس خیرات مانگنے کو آئی تھی۔ اس کا گھر نہیں۔ اب تیرا ہی گھر رہ گیا ہے۔

نہ ماں جی! ہم نے تو کچھ کہا ہی نہیں۔ ذوالفقار۔ بہن تو سامنے کھڑی ہے دریافت کر لو"

چُپ رہو! زبان بند کر لو۔ چرخے کی طرح منہ مت چلاؤ ادنے

خاندان کی بیٹی بھلا! اچھی بات یہ کیسے کرے ہماری بیٹی کے آنچل پر بتاؤ تو تم نے کیوں تیل گرا ڈالا؟ نند ہے تو ایسی ہنسی کون کرتا ہے۔ کہ کپڑا ہی خراب ہو جائے۔ یہی بھلی عورتوں کا رہن سہن ہے۔ میں تو کہتی ہوں کسی کا گھمنڈ نہیں رہتا۔ تو بھی اکڑ فوں نہ دکھا۔ سارا غرور دھرا کا دھرا رہ جائیگا۔

مجھے تو غرور وتکبر نام کو بھی نہیں ہے ماں جی! نہ معلوم تم کیوں بلا وجہ مجھ سے ناراض ہو جس کے بھروسے میرا آرام اور سہاگ ہے اس کے بگڑے سے تو ہمارا ہی زیادہ نقصان ہے۔ ایسی باتیں کیوں کرتی ہو۔ میں نے کب بہن ذوالفقار کے آنچل پر تیل گرایا۔ کہو ذوالفقار! تم نے ماں سے ایسی جھوٹی بات کیوں لگائی۔

ذوالفقار کے منہ سے بات نکلنے سے پہلے ہی ساس نے سلمہ پر جھپٹ کر کہنا شروع کیا ——— ہاں لگایا ہے تو کیا کرے گی رے تو"

اب تو سلمہ سے کچھ کہتے نہ بنی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ کر رخساروں سے نیچے گرنے لگی۔

ساس کا غصہ برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ سلمہ جس قدر نرمی سے بات کرتی تھی ساس کا پارہ اسی قدر تیز ہوتا تھا اس کی نرمی جیسے آگ پر تیل کا کام کرتی تھی۔ اس غصہ کی وجہ صرف ذوالفقار کے بھابی کے متعلق دورخ بیانی ہی تھی۔ اماں کو معلوم ہے۔ یا نہیں کون جانے؟ جو جس سے

اندھی محبت کرتا ہے۔ اس کی یہی حالت ہُوا کرتی ہے۔

تھوڑے عرصہ میں اس کا بہو کی نسبت اس قدر تعجب خیز مزاج بن گیا۔ کہ اگر کوئی اس کے کسی فعل کی تعریف بھی کرتا۔ تو یہ جل بھن جاتی کوئی سلمہ سے بات بھی کرے۔ تو اسے گستاخی تھی جو اس سے ملتی جلتی تھی۔ یہ اس پر بھی ناراض ہو جاتی۔ اور ذوالفقار کو آبادہ رسان پر چڑھا کر جلا دیتی تھی۔ اور جو کچھ ذوالفقار کہتی بلا سوچے سمجھے اسے درست تسلیم کر لیتی تھی۔

اب اگر محلے یا پڑوس کی کوئی عورت ذوالفقار سے گفتگو کرنے کی بجائے سلمہ سے بات چیت کرتی تو اسے اماں اپنی بے عزتی تصور کرتی تھی۔ کوئی اس کے گھر آکر ذوالفقار کی بجائے سلمہ کو آواز دیتی تو ساس کے دہکتے انگاروں پر تیل بھڑک اٹھتا۔ وہ غصہ میں آکر اپنی اس قدر خوفناک صورت دکھلاتی۔ جس سے سب کو چھٹی کا دودھ یاد آجاتا تھا۔

ہمیشہ کی طرح ایک دن شام کو اماں جان اپنے غضب ناک لہجہ میں سلمہ کو رعب دکھا رہی تھی۔ کہ دالان میں کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ سب نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ دوسرے محلہ کے طفیل میاں ہاتھ میں چھوٹی سی گٹھڑی لئے پہنچ گئے۔ ان کے آنے سے پہلے ہی سلمہ شرم کی وجہ سے دوسرے کمرہ میں چلی گئی تھی۔ ساس نے بھی اپنا غصہ ہضم کر کے منہ بند کر لیا۔ ذوالفقار اپنی ماں کے پاس ایسے ہی بیٹھی رہی۔ سلمہ نے

جو چراغ جلایا تھا۔ وہ ہوا کے ہلکے سے جھونکے کے باوجود جلتا ہوا لہرا رہا تھا
طفیل نے برآمدے میں آکر پکارا ——— بڑی اماں کہاں
ہیں؟"
آؤ بیٹا! ہم نے جانا کہاں ہے جہاں ہم نے جانا ہے وہاں کا تو خط
بھی نہیں آتا"، نامعلوم اماں اور کیا کچھ کر جاتی۔ لیکن طفیل نے درمیان میں
ہی بات کاٹ کر کہا ——— "معین بھیا نے یہ دیا ہے اماں"
قریب بیٹھی ذوالفقار کو دیکھ کر اماں بولی ——— "لے لے رے ذوالفقار
——— پھر دریافت کرنے لگی۔
"الہ آباد سے آئے ہو بیٹا"
"ہاں اماں! آج دوپہر کی گاڑی آیا ہوں۔ معین بھیا خیریت سے ہیں۔
سب اچھا ہے"
"گھر آنے کی کچھ کہتے ہیں"
"ابھی کہاں اماں! آئیں گے تو بڑے دنوں کی رخصت پر ہی"
واقعہ اس طرح ہوا کہ معین الدین نے ہی طفیل کو الہ آباد لے جا کر دتّیل
داس منوہر لعل کی دوکان پر انگریزی خط و کتابت کی ملازمت دلوائی تھی یہ پچاس
روپیہ ماہوار کی ملازمت معین کی مہربانی کا نتیجہ تھا۔ اس لئے طفیل معین
الدین کا بڑا پاس کیا کرتے تھے۔ ادھر آواز پہچان کر سلمہ بھی اوپر
کے برآمدے میں آکھڑی ہوئی۔ شوہر کی صحت و سلامتی جاننا ہی اس کا
مطلب تھا۔ آج ساس اور نند تو اس سے ناراض تھیں وہ بھلا کیسے کوئی پیغام

پہنچا تھا۔ جب وہاں سے آدمی آیا ہے شوہر کی حالت کا جاننا بیوی کا قدرتی فرض ہے وہ خاموشی سے کھڑی باتیں سنتی رہی۔

لیکن طفیل پیشانی کھجلا کر بولے ـــــ بھیا نے تو بھابی کے ہاتھ میں دینے کو کہا ہے"

"اچھا دے دو اس کو بھلا اب ہم سے کیا کام ـــــ" کہتی ہوئی اماں ہٹ گئیں ذوالفقار کو ڈانٹ کر بولی ـــــ اب کیوں وہاں کھڑی ہے چنڈالنی ادھر ہٹ وہاں سے"

ذوالفقار منہ بنائے واپس ہو گئی۔ لیکن سلمہ کو یہ بات پسند نہ آئی اس کا دل طفیل کی گفتگو سے بھی دہل گیا تھا۔ اپنے آپ کہنے لگی ـــــ

یہ تو اچھا نہیں۔ ان کو ایسا کہنا چاہیئے تھا۔ بچاری ذوالفقار کے بھیا کے علاوہ ہے ہی کون؟

وہ بے چاری محبت سے لینے گئی۔ اس حالت میں اس قدر سخت کلامی سے اس کے جی کو جلانا اچھا نہیں ہے۔ میرے لئے اس میں اگر کچھ ہوتا تو میں لے لیتی۔ اور نہ بھی ملتا۔ تو کیا گھر ہی میں تو ہے جان پڑا کہ اس میں جو کچھ ہے اس کا انہیں پتہ چل گیا۔ اس دفعہ جو ایک جلی آئینہ ایک عطردان اور دو آبنوسی کنگھیاں بھیجی ہیں۔ وہ مجھے نہیں ملی تھیں۔ اس لئے اب یہ کہہ کر بھیجا ہے لیکن میں نے ان سے اس کے متعلق کچھ کہا تو نہیں تھا۔ اب کے جو وہ گھر آئے تھے۔ تو شاید وہ چیزیں نہ دیکھ کر سب کچھ سمجھ گئے ہوں گے۔

طفیل نے پوچھا۔ تو بھابی جی ہیں کہاں "

ذوالفقار تو کچھ نہ بولی، ساس منہ بنا کر بولی ——— گئی ہوئی ظہیراں کے گھر۔ کسی دوزخ سے تلاش کر لاؤ بیاہ "

مسکرا کر زینہ پر چڑھتے ہوئے طفیل نے کہا ——— بھلا۔ دنوں میں تم ہمیں دوزخ بھیجتی ہو اماں۔ اچھا اللہ دے اور بندہ سہے "

نہ بیٹا! ہم کو ہنسی مخول کہاں آتا ہے ہمارے جی میں تو آگ بھڑک رہی ہے خالی اس رانڈ بیٹی کے لئے میں مر رہی ہوں۔ کہاں جاؤں کیا کروں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا طفیل "

کہو اماں! اس قدر ناراض کیوں ہو رہی ہو "

کیا کہوں بیٹا۔ اس جسم میں جو آگ بھڑک رہی ہے۔ اس پر پانی ڈالنے والا اور دل کو تسکین دینوالا کوئی نہیں۔ جب تک زندہ رہوں گی جلتی رہوں گی۔

ایسی باتیں منہ پر نہ لاؤ اماں! انہیں

کونسی کمی ہے۔ افسر معین بھیا پر بڑے
خوش ہیں۔ اب کے مئی کے سال میں
بھیا کو نائب دفتر کا منصب ملتا صاحب
کے نہ ہونے پر بھی یہ خود کام چلا لینگے۔
بھیا پر صاحب بہادر بڑے خوش ہیں
ان کی بڑی تعریف لکھ کر افسروں کو
بھیجی ہے۔ اب بھیا کی تنخواہ پورے
تین سو ماہوار ہو جائے گی

بڑے سہی اس بہو کا پیٹ
مل جائے وہی تو گھر کی مالک ہے ہم نے
اسی رانڈ بیٹی کے ساتھ ان سے بھیک
مانگی ہے۔ یہ بڑھاپا ہمارا الہ آباد
میں ہی کٹے گا بیٹا!

تو بُرا کیا ہے۔ اماں جو اس قدر غصہ
کر رہی ہو"۔

بُرا کچھ نہیں بیٹا! تم تھکے ہارے
الہ آباد سے آئے ہو چیز بی مالکن کو
دیکر تم آرام کرو۔ میرا سر تو ارکھلی
میں پڑے نہ کہیں اور کچھ کہا تو سر

پر پتھر گرے گا۔ روٹی ملتی ہے وہ
بھی بند ہو جائے گی تو پھر کس کے
دروازہ پر جاؤں گی۔

دیکھو جیسن بھیا نے تم کو کچھ کہنے
کو کہا ہے!

"نہیں نہیں"

طفیل زینہ پر نہ چڑھے گٹھڑی وہیں
رکھ کر اتر آئے۔ اور اماں کو دے
دینا کہہ کر چلتے بنے

ذوالفقار کا سلوک

طفیل کے چلے جانے پر سلمہ ڈرتی ہوئی
ملزم کی طرح زینہ سے نیچے اتری
اور آہستہ سے ساس کے پاس جا کر
بولی: نہ ماں! وہ ایسی بات نہیں کہہ سکتے
طفیل نے مزاحاً کر دی ہو گی۔

اس کے جواب میں اس نے کچھ نہ
کہا۔ وہ منہ بنائے ویسے کی ویسی بیٹھی
رہی۔

سلمہ نے کہا ــــ لے آؤ بہن
کھول کر دیکھیں اس میں کیا ہے"
ذوالفقار نہ اٹھی اور نہ منہ سے کچھ
کہا۔ عباس بھی چپ رہی سلمہ یہ دیکھ
کر کچھ دیر سوچتی ہوئی کھڑی رہی پھر
جی میں سوچا۔ کہ ان کے سامنے لاکر
گٹھڑی کھولنا بہتر ہے نہیں تو نہ
معلوم یہ کیا کچھ کہیں۔
اسی خیال سے سلمہ نے زینہ سے
گٹھڑی اتار کر وہاں کھولی عباس بھی
وہیں بیٹھی ترچھی نظروں دیکھتی رہی
اس کے اندر چار چھوٹی چھوٹی
اور گٹھڑیاں تھیں۔ ایک میں پانچ چھوٹے
چھوٹے گوبھی کے پھول تھے۔ ایک
میں دو شیشیاں بھری ہوئی
تھیں تیسری میں دو بنارسی ساڑھیاں
چوتھی میں خود بخود سیاہی دینے والا
قلم تھا۔ اور ایک میں بند لفافہ میں چٹھی
تھی۔

سب کچھ کھول کر سلمہ نے الگ الگ رکھ دیا۔ اور چٹھی کھول پڑھنے لگی پڑھتے ہوئے اس کو ہنسی آ گئی۔

معین الدین کی ماں سب کچھ دیکھتی رہی اس نے کچھ نہ پوچھا مسرت یا ناراضگی کچھ بھی اس کے چہرہ سے نمایاں نہ ہوئی۔ جیسے تر چھی چتون سے دیکھ رہی تھی۔ دیکھتی رہی۔

مسکرا کر سلمہ بولی —— "اب بات سمجھ میں آ گئی اس لئے گھڑی میرے ہاتھ میں دینے کو کہا ہے"

ساس نے کچھ ہاں نہ، نہ کی اور نہ کچھ اپنا خیال ہی ظاہر کیا۔ سلمہ تین سطر میں دو اوپر کی چھوڑ کر کہنے لگی —— "دیکھو ماں جی اس میں لکھا ہے —— گھڑی تم کو ملے گی ذوالفقار ایک ساڑھی مانگتی تھی۔ ایک اس کو اور ایک تم کو بھیجی ہے تم کو اپنے ہاتھ سے ذوالفقار کو پہنچانے کا شوق ہے اسی لئے تمہیں بھیجی ہے۔ اپنے ہاتھ سے اس کو پہنچا دینا۔ اماں کو کھانسی ہوتی تھی۔ بلغمی کھانسی اس موسم میں ہونا بہتر نہیں۔ انہیں کیلئے بنگال کیمیکل کا "سکھراسک" بھیجا ہے اپنے ہاتھ سے ماں کو پلاؤ۔ باقی سب رکھ دینا جب ضرورت ہو دیا کرنا یاد رکھو ماں دوا پینے سے بہت ڈرا کرتی ہے۔ اس کی باتیں نہ ماننا۔ تم خود ٹھیک طرح سے دوا پلا دینا۔ تمہارے لکھنے کو قلم نہیں رہی تھی۔ اس لئے بلکہ بھیجی ہے ابھی گو بھی کے پھول اچھے نہیں آرہے اسی لئے تھوڑے بھیجے ہیں۔ ذوالفقار سے کہنا شرم نہ کرے جیسا ہو لکھ دیا کرے۔ لکھتے ہو لے ہی لکھنا آ جائے گا۔

جب کوئی کہے تیری قربانی ہے کہ پانی میں تیرنا سیکھیں گے وگرنہ کبھی تیراک نہیں بن سکتے۔ تم سے جہاں تک ہوسکے ذوالفقار کو پڑھایا لکھایا کرو اماں کی خدمت اور تعظیم میں کسر نہ اٹھا رکھنا۔ میری انہیں صحت وسلامت کی خبر دینا"

یہ سن کر ساس نے لمبی سانس لی۔ سلمہ پھر بولی —— نا معلوم کب کوئی کسی کام کے لئے کیا کچھ کہہ بھیجتا ہے۔ سب دیکھ سن کر ہی اس کا مطلب کھلتا ہے۔ نہیں تو تجارت میں کام خراب ہو جاتے ہیں اماں جی۔

بہو کی بات کا کوئی جواب نہ دے کر ساس بیٹی کو کہنے لگی ——

سن لی نہ رہے چٹھی اپنے بھیا کی۔ ہمارا بیٹا ہزاروں لاکھوں میں سپوت رہا ہے اور۔

بڑھیا نے اصلی مطلب بھانپ کر دل کی سچی بات کہی لیکن ذوالفقار غرور میں مست تھی۔ منہ پھلا کر کہنے لگی۔

"سپوت تمہارا بیٹا سپوت ہے تو بنا رہے ذوالفقار سب سے جانتی ہے میں بہری نہیں ہوں اماں"

اب اصلی بات نہ سمجھ کر بوڑھیا نے پوچھا: سمجھتی ہے رے تو ذوالفقار"

"یہ سب اوپر کی باتیں ہیں"

"کیسی اوپر کی میری سمجھ میں نہیں آیا بیٹی!"

"ارے یہ چالاکی ماں تمہاری سیدھی سادھی عقل میں نہیں بیٹھ سکتی"

"تو بولتی کیوں نہیں کیا بات ہے"

"بات اصل میں ہے تمہارا سر اور اپنے جوتے اور کیا کہوں"

بیٹی کی باتیں ماں کی سمجھ میں تو نہ آئیں۔ لیکن یہ ضرور سمجھ گئی۔ کہ اس کی بیٹی کی بڑی عقل ہے کوئی۔ سکندر چالاکی دکھائے اس کے سامنے سب ہیچ ہے۔ دنیا میں ذوالفقار سے بڑھ کر کوئی عقلمند نہیں ہے
